کہتے کہتے مادھوی کے منہ سے ایک بار اور قہقہہ لگایا — ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے —

"ہاں مندھو ڈیر! پھر وہ تڑکے ہی دن سویرے ہم پہلگام جائیں گے — دُور دُور تک گھوڑوں پر بیٹھ کر سیر کریں گے، کھلے آسماں کے نیچے پیار کا ایک گھروندا تیار کریں گے — ہائے اُس پیار کے گھروندے میں ہمارے بچے کھیلیں گے —— اور چاندنی راتوں میں لِدّر کے کنارے ہم سگریٹ پیتے پیتے وہیں سگریٹوں کے بیچ ہی سو جائیں گے۔"

"وہ کیا وِنڈر فل سگ ہوم ہی کبھی کبھی میرا انتظار کرتے کرتے وہیں بیچ پر سو جاتا تھا۔"

"ہٹاؤ اب اُس کیا وِنڈر کے بچے کی باتیں۔"

"ہنسی آتی ہے، پگلا اردو سے ایک لفظ بھی بولتا۔ صرف چپ چاپ کانچ کے ٹکڑے چنتا رہا۔"

مادھوی نے ایک اور قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— میں حیران و ششدر اس عجیب سی لڑکی کو دیکھتا رہا۔

"پگلا کہیں کا۔ پرس شاید آدمی بوتل ہاتھ سے گر گئی اور پھر چپ چاپ کانچ۔" روتے روتے ہی وہ کہتی جا رہی تھی —— مجھے غصہ آگیا۔

"مادھوی!" میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ وہ رُک گئی اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مندھو ڈیر! ہم تو ابھی شادی کا پلان بنا رہے ہیں۔"

"شادی؟" اُس نے دھیمے سے کہا اور دوسرے لمحے وہ لپک کر کھڑی ہو گئی، اُس نے جھپٹ کر میرے پاس سے پرس اُٹھایا اور باہر بھاگ گئی۔

"مادھوی کہاں جا رہی ہو؟" میں نے حیرت سے پکارا۔

"شادی کرنے — اُس کیا وِنڈر کے ساتھ۔" اُس نے پلٹ کر جواب دیا اور دوڑ

مجھے وہ بازار کی بھیڑ میں کھو گئی ★★

ختم شد

عدالت میں ہوگی۔ تمام کورس دائرکلب میں ایک چھوٹی سی پارٹی ہوگی۔ پھر ہم دونوں کے لئے پہلگام جائیں گے ۔۔۔ ہائے کتنی خوبصورت زندگی کے خدوخال ہمارے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے اُبھرنے لگے۔

"مجھے ایک کمیاونڈر سے محبت تھی" اُس نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا۔ "مگر میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، کیونکہ مجھے ایک بے رنگ سی، بے ڈھب سی، بے جان سی زندگی پسند نہیں۔ ایک کمپاونڈر کے ساتھ مجھے اور کیا ملتا ۔۔۔ آج میں اُس کو دیا آخری مصافحہ کر یہاں آگئی ہوں ۔۔۔ میری بات سُن کر اُس کے ہاتھ سے دوائی کی شیشی گر کر چور چور ہوگئی ۔۔۔ اور وہ کانچ کے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے چنتا رہا ۔۔۔ جیسے اپنے دل کے ٹکڑے چن رہا ہو"

مادھوی نے یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا ۔۔۔ جانے کیوں یہ قہقہہ سُن کے میں چونک پڑا ۔۔۔

"چیزیں چیزیں ٹوٹتی رہتی ہیں ۔۔۔ آدمی کو بہت سی باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے"

"ہاں تو اور کیا ۔ بیگلا! کانچ کے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے چنتا رہا۔ زباں سے کچھ کہا نہیں"

مادھوی نے کہا اور اُس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ۔۔۔ مجبوراً مجھے بھی اِس ہنسی میں شریک ہونا پڑا ۔۔۔

صدمہ ہوا ہوگا بیچارے کو ۔۔۔ یہ غریب قسم کے لوگ قدرے جذباتی ہوتے ہیں"

"میرا شتھاسے میں بھی کیا ذکر لے بیٹھی ۔۔۔ میں نے ماں کو بتا دیا ہے کہ شادی سیدھے سادھے ڈھنگ سے ہوگی۔ کوئی بینڈ باجہ نہیں ہوگا کوئی آتشبازی نہیں ہوگی ۔۔۔ وہ کمپاونڈر تو بینڈ باجے کے خواب دیکھتا ہوگا۔ بیگلا! کانچ کے ٹکڑوں کو ایسے چنتا رہا جیسے دل کے ٹکڑے ہوں ۔۔۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس ہاتھ کو تھام لینا چاہیے، تاہم میں چاہتی ہوں کہ تنہائی میں اپنے دل سے مشورہ کر لوں۔"

"یہی تو بڑی غلطی ہے۔ آج کل مشورہ دل سے نہیں دماغ سے کیا جاتا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور میں اسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر چھوڑ آیا۔

اس رات جب میں گھر پہنچا تو میرے دل میں چند ہی امنگیں جاگ اٹھی تھیں ان امنگوں کو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک عجیب طرح کا امید و بیم کا احساس میرے اندر جاگ اٹھا — اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میرے اندر کے شوکیس میں جو جگہ خالی تھی، اس کے لئے میں نے کبھی کوئی کیوریو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہائے، یہ شوکیس کب سے خالی تھا — اور اچانک، غیر ارادی طور پر میں نے مادھوی کو اس شوکیس میں رکھا — اندر کی کایا ہی بدل گئی —

میں کیسا کیوریو ڈیلر ہوں جس نے اس قدیم نایاب اور بے قیمت کیوریو کو نظر انداز کیا تھا — محبت!!

وہ رات میں نے بے قراری میں گزار دی — دوسرا دن بھی میں نے بے قراری میں گزار دیا — شام کو کلب میں پہنچا تو ایک عجیب طرح کے اضطراب نے پریشان کیا — اور ایسے میں میرے اندر کا بزنس مین مر گیا، زندگی کا سارا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ صرف ایک جذبہ قائم رہا۔ محبت کا جذبہ — اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں مادھوی کو کبھی کلب میں تاش نہیں کھیلنے دوں گا۔ اس کو کبھی دکان میں کام نہیں کرنے دوں گا۔ اس کو میں دل کے اندر والے شوکیس میں چھپا کے رکھوں گا — کسی ان جانے ارمان کی طرح —

دوسرے دن مادھوی میری دکان پر آئی۔ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی — آتے ہی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی — امید و بیم کے چند جاں لیوا لمحے گزر گئے —

"میں نے ماں سے مشورہ کیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں میری اپنی پسند کو قبول کرنا منظور کر لیا ہے۔" اس نے جھجک کر کہا — میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — پھر ہم نے مل کر ایک نئی زندگی کا ڈھانچہ تیار کیا۔ ہر ایک بات تفصیل سے طے کی — شادی

ملایا دو چار ہلکے سے کش لے کر اُس نے میری طرف دیکھا — دیر تک دیکھتی رہی۔

"آپ کی جان پہچان کیا ہے؟"

میں اِس سوال پر چونک اُٹھا —

"جان پہچان؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اوہ! جان پہچان سے میری مراد آپ کا بزنس، آپ کی اسٹینڈنگ وغیرہ وغیرہ"

"ارے ہاں! واقعی آپ کو یہ سوال کرنے کا اور اس کا جواب پانے کا حق ہے۔"

میں اس کی صاف گوئی سے کافی متاثر ہوا۔ میں نے اُسے اپنی جان پہچان بتائی
ہی یہ کہ میں ایک کیوریو شاپ کا مالک ہوں، جس میں اگر دیکھا جائے تو چند سو روپیوں
کا مال ہے، جس کی قیمت اگر چکانے والا مل جائے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں ہو سکتی ہے —
اور یہ کہ میں روزمرّہ کے اخراجات فلیش کھیل کر پورے کرتا ہوں کبھی کبھی ہارتا بھی ہوں
مگر زیادہ تر میری قسمت اس معاملے میں مجھ پر مہرباں ہی رہتی ہے — میں نے اُس کو بتایا کہ
میرے پاس دو بینک اکاؤنٹ ہیں — میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں جس مکان میں
رہتا ہوں، وہ سات پشتوں سے ہمارا آبائی مکان ہے اور ظاہر ہے جس حالت میں ہے
باہر سے تو اس کی طرف دیکھ کر اُبکائی آتی ہے مگر اندر میں نے اُس کے چند ایک کمروں کو بڑی نفاست
سے سجایا ہے —

"اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے یہ سب حقیقتیں تم پر کیوں ظاہر کی ہیں؟ اس لئے کہ
مجھے تمہاری حقیقتوں کا علم ہے۔ اس لئے ہم دونوں مل کر ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔

اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا۔ پھر اس کو ایش ٹرے میں مروڑ کر اُٹھتے ہوئے
کہا —

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہیں — کیا آپ
مجھے گھر تک چھوڑنے آئیں گے؟"

"ضرور — مگر تم نے بات ادھوری چھوڑ دی ہے — میرے پھیلائے ہوئے ہاتھ کو
جواب کی ضرورت ہے۔"

وقت میں دو زندگیاں گزارتی تھی — ایک غریب نرس کی زندگی، جس میں وہ محنت کا پیکر بن کر مریضوں کے تپتے ماتھے پر اپنا شفقت کا ہاتھ رکھتی تھی، اُن کے زخموں کی ٹیس کو، درد کی کرب ناکی کو اپنی میٹھی، پیاری اور کومل مسکراہٹ میں بہلا دُھلا کر اُن کے لئے ایک سہارا تیار کرتی تھی، اور پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتی تھی — اور ایک شوخ رنگ تتلی کی زندگی، جس میں وہ بڑھیا اور جدید فیشن کے کپڑے پہن کر ہر شام ٹیکسی میں بیٹھ کر سن رائز کلب میں آتی تھی اور فلش کھیلتی تھی، ٹوِسٹ کرتی تھی، بیئر پیتی تھی اور دو تین گھنٹے ایسا محسوس کرنے کے بعد چلی جاتی تھی — اُس گندے سے، ٹوٹے پھوٹے سے مکان میں، جہاں اُس کی اُستانی ماں دن بھر کی تھکان سے چور اس کا انتظار کرتی رہتی تھی —

یہ بھی اطلاع ملی کہ مادھوری نے کبھی اپنی ماں کو تر مندگی کا سامنا نہیں کرنے دیا تھا۔ اور اس نے حامی ماں کو ایک بھروسہ دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اُٹھائے گی جس سے اُسے لوگوں سے نظریں چرانا پڑیں، اُس نے وہ بھروسہ اور اعتماد بھی قائم رکھا تھا۔ میرے لئے یہ اطلاعات کوئی اچنبھے کی بات نہ تھیں، کیونکہ آج کل ہر شخص دو دو بلکہ تین تین زندگیاں ایک وقت گزارنے پر مجبور ہے — اسی لئے ایک بیوپاری ایک وقت بیوپاری بھی ہوتا ہے، اسمگلر بھی ہوتا ہے اور اپنے محلّے کا پریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے۔ یا ایک افسر ایک وقت افسر بھی ہوتا ہے اور کسی فرم یا کمپنی کا مالک بھی — یا ایک سادھو ایک وقت مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے، بردہ فروش بھی ہوتا ہے اور جوئے خانے کا مالک بھی ہوتا ہے۔

اس لئے مجھے مادھوری کی دو زندگیوں کے بارے میں کوئی تعجب نہ ہوا، بلکہ میرا ارادہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا اور پختہ ہو گیا۔

چنانچہ ایک دن، جب میں نے اُس کو "پیا گرا" میں ڈنر پر مدعو کیا تھا، میں نے اپنا آپ اس کے سامنے پیش کیا۔ اُسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ حسبِ معمول کھانا کھاتی رہی — اُس نے کوئی بات نہ کی، صرف چپ چاپ کھانا کھاتی رہی۔ میں بھی خاموش کھانا کھاتا رہا — پھر کافی آئی — اُس نے میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر

پٹا ہوا ___

دوسرے دن بھی اس کے ساتھ کھیل ہوا، اور میں ہار گیا۔ تیسرے دن بھی اس نے دہائی ہاتھ جاکر مجھے اپنی مہارت کا گرویدہ بنا دیا۔

اسی شام میں نے ایک ممبر سے پوچھا " کون ہے ؟"

" مادھوی ! "

" وہ تو میں جانتا ہوں اس کا نام مادھوی ہے ___ آگے پیچھے کی کوئی تاریخ ؟"

" ہٹاؤ یار اتاریخ جان کر کون سا امتحان دینا ہے ! "

چوتھے روز میں نے مادھوی کو ایلیسن میں ڈنر کی دعوت دی، جو بلا کسی ہچکچاہٹ کے قبول کی گئی ___ اور پہلی ملاقات کے پورے دس دن کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ مادھوی کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنی ہیں اور دوسرے یہ کہ مادھوی کے ساتھ جلد از جلد شادی کرنی ہے۔ اسے آپ سے کیا چھپانا ، اس فیصلے میں محبت کو کم اور مصلحت اور ہوس کو زیادہ دخل تھا ___ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق مادھوی کو لائف پارٹنر بنانے میں فائدہ ہی فائدہ تھا ___ ایک تو یہ کہ کاروبار میں میری مدد کر سکتی تھی۔ انگریزی فر فر بولتی تھی، رکھ رکھاؤ اور دنیا داری میں ماہر تھی ___ اور دوسرے یہ کہ کلب میں بلیئرڈ بھی کھیل سکتی تھی اور اس معاملے میں میری اور اس کی مہارت کافی مدد دے سکتی تھی۔

آج کل کی دنیا میں آدمی MATTER OF FACT نہ ہو تو زندہ رہنا مشکل ہے۔ اور اگر زندہ رہے گا بھی تو لاکھوں کروڑوں سفید کالروں کی طرح سانے ڈھب سے رنگ و ڈھنگ ڈھاور نے مردہ زندگی گزارے گا ___ میرے لیے ایسی زندگی سے موت بہتر تھی چنانچہ پلان کے مطابق کام شروع ہوا ___ اور پہلا مرحلہ طے ہوا یعنی مادھوی کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئیں ___ اطلاع کے مطابق مادھوی ایک اسکول ماسٹر کی بیٹی تھی، ریسنگ ہوم میں بطور نرس کے کام کرتی تھی۔ اور دیا تیج بجے کے بعد اس زندگی کا لبادہ اتار کے ایک دوسری زندگی کا ڈریس پہنتی تھی ___ یعنی مادھوی ایک ہی

نفیس اداروں سے سجائی گئی ہے اور یہی سجاوٹ اس دکان کا کل اثاثہ ہے، ورنہ تمام کیوریو تو ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے ساتھ رخصت ہو گئے ہیں۔ کبھی کوئی جاہل سا نو دولت سیٹھ ساہوکار اس دکان میں داخل ہو کر لارڈ ڈلہوزی کی پائپ یا نادر شاہ کی تلوار یا یوسف شاہ چک کا سرکاری پیراہن یا تاتیا ٹوپے کے گھوڑے کی لگام بڑی منت سماجت کے بعد اور کوئی چار پانچ ہندسوں والی رقم ادا کر کے باہر آتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر اس دکان میں مکھیاں ہی بھنبھنایا کرتی ہیں۔ وہ اس دکان کا پروپرائٹر ہے۔ ایسی دکان کے لئے گاہک فراہم کرنے کے لئے میں شہر کے تقریباً تمام کلبوں کا ممبر تھا۔ اور کلبوں کی ممبری نے مجھے فلش کھیلنے کی طرف راغب کیا تھا۔ ویسے سودا مہنگا بھی نہ تھا کیونکہ فلش کھیلنے میں مجھے قدرے مہارت حاصل ہو گئی تھی اور عام طور پر کلبوں کی فیس اور دیگر اخراجات کے لئے پیسہ مجھے اسی شغل سے ملتا تھا۔ اس ناطے آپ اسے میرا سائڈ پروفیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لفظ پر میں ناراض نہیں ہوتا ہوں، کیونکہ سائڈ پروفیشن کے بغیر آجکل کے مہنگائی کے زمانے میں گزارہ مشکل ہے۔ اسی لئے اسکول ماسٹر کا سائڈ پروفیشن ٹیوشن پڑھانا ہے، آرٹسٹ کا سائڈ پروفیشن، سائن بورڈ پینٹ کرنا ہے، کلرک کا سائڈ پروفیشن رشوت لینا ہے۔ لیڈر کا سائڈ پروفیشن منسٹر بننا ہے۔ ایکٹر کا سائڈ پروفیشن صابن یا تیل کے اشتہاروں کا ماڈل بننا ہے۔

بہر حال اس رائز کلب میں، میں اپنے سائڈ پروفیشن میں مشغول تھا کہ میری ملاقات مادھوی سے ہوئی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی ٹیبل پر بیٹھ کر کھیل رہی تھی جس پر میں کھیل رہا تھا۔ اور اس نے ایک دو ہاتھ ایسے چلے کہ مجھے اپنی مہارت پر سے ایمان اٹھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ تنگ پائنچوں والی ماڈرن شلوار اور ڈھول پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنگ قمیص۔ بالوں کی لٹیں پریشان حالت میں کندھوں پر لہراتی ہوئی، ایک جل پری لگتی تھی۔ ہنستی تھی تو دونوں گالوں پر گڑھے بنتے تھے۔ ان گڑھوں کے بارے میں فارسی کے شاعروں نے دیوانوں کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ میری سوچ کے مطابق تو یہ بھی ایک کیوریو تھا۔ گلستاں بوستاں کے زمانے کا کیوریو، مگر اٹلس میں

کانچ کی دنیا

اُس کا نام مادھوی تھا۔ اور اس کی ایک الگ سی زندگی تھی۔ جانے کیسی زندگی تھی۔ کیونکہ کسی نے اِس زندگی کے پہلے باب نہیں پڑھے تھے۔ ہر ممبر نے صرف وہی صفحہ دیکھا تھا جو اُس کے سامنے کھلا تھا۔ ہر ممبر اُسی عبارت سے آشنا تھا جو اِس کھلے ہوئے صفحے پر لکھی تھی ۔۔۔ اس کے بعد یہ کتاب میری آنکھوں کے سامنے آئی اور میں نے ایک بڑی غلطی کی جو اِس کتاب کو شروع سے پڑھنا چاہا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طلسمی کتاب کے ساتھ یہ بددعا وابستہ ہے کہ جو کوئی صفحہ پلٹ کے دیکھے گا، اُس کا اپنا صفحہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔۔۔

میں اُن دنوں نیا نیا ہی اس رائز کلب کا ممبر بنا تھا۔ میں رائز کلب میں فلش کھیلی جاتی تھی، اور میں فلش کھیلنے کا دلدادہ ہوں۔ اس سے پہلے کہ آپ میرے بارے میں کوئی رائے قائم کریں، میں اپنا تعارف پیش کرتا ہوں۔ بی مارکیٹ کی چودہ نمبر دکان آپ نے ضرور دیکھی ہو گی، کیونکہ یہی ایک کیوریو شاپ اس ساری مارکیٹ میں ہے۔ آپ چاہیں تو اسے کباڑیئے کی دکان بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اِس لفظ سے مجھے چڑ ہے۔ دکان نہایت

ہاں تو جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔ جانکی لوٹ کے آگئی۔ مجھے بستر پر پڑا دیکھ کر وہ پہلے
چونکی۔ پھر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر خلط ملط ہو گئے پھر اُس نے ایک ہی جست میں
میری چارپائی کے قریب آنے کی کوشش کی مگر کمرے کے بیچ میں یکلخت رُک گئی
ابھی تک سو رہے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
بیمار ہوں جانکی۔ میں نے تھکی تھکی سی آواز میں جواب دیا۔
بیمار ہو؟ پر ایک دم بیمار کیسے ہو گئے؟
کیسی بے ہودہ باتیں کر رہی ہو۔ آدمی منصوبہ باندھ کے تو بیمار نہیں ہوا کرتا۔
کیا بیماری ہے؟
بخار میں تپ رہا ہوں
ایک لمحے کے لئے وہ جیسے کشمکش میں پڑ گئی دوسرے لمحے اُس نے میری چارپائی کے
پاس آکر اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا ہائے کس قدر ٹھنڈا ہاتھ تھا۔
کھڑکیاں دروازے کیوں بند رکھے ہیں۔ اُس نے قدرے غصے سے کہا اور کھڑکیاں
کھولنے لگی۔
کیا کر رہی ہو جانکی مت کھولو یہ کھڑکی۔
کیوں؟
کہہ دیا نا یہ کھڑکی مت کھولو۔
مگر کیوں۔ ؟ کیا ہے اس کھڑکی کے باہر؟۔ اتنا حبس ہے کمرے میں ۔۔ یہاں تو
اچھے بھلے آدمی کو بخار آ جائے گا۔
اُس نے کھڑکی کھول دی پل کے لئے ایسا لگا جیسے روشنی کی ایک تیر کرن
آکر میرے سینے میں اُتر گئی ایک لمحے کے لئے آس پاس کی ہر چیز نظر سے اوجھل ہو گئی۔
دوسرے لمحے میری نگاہیں تار سے لٹکتی ہوئی پرندے کی لاش پر جم گئیں جانکی نے میری
نگاہوں کا سکوت دیکھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سامنے تار سے لٹکی ہوئی پرندے
کی لاش دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اُس نے شاید کچھ کہا۔ مگر آواز کہیں بہت دور سے سنائی

حکومت جس کو تم گالی دے رہی ہو۔ اُس میں، میں بھی شامل ہوں۔
ناتم اُس میں شامل نہیں ہو۔
کیوں؟
اس لئے کہ تم نے آج تک کبھی مجھ سے کھیل نہیں خریدے ہیں۔ تم نے آج تک مجھے
کبھی اُن نظروں سے نہیں پایا ہے، جو آمد اور ہوس کے دوراہے پر بھٹک گئی ہوں۔
ارے اتنے تو مجھے آج تک کبھی آنکھ بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔
مجھے ہنسی آگئی۔ بہت ہنسی آئی۔
ہنس رہے ہو؟ اس تمہاری ہنسی نے مجھے کاٹ کے رکھ دیا ہے۔ اُس نے کہا اور
غصّے میں چھری اُٹھا کر سامنے پڑے ہوئے خربوزے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔
مجھے لگا جیسے اُس نے اپنے کسی ارمان کو کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ رات بھر مجھے خواب میں چھریاں
اور خربوزے نظر آئے۔ طرح طرح کی چھریاں اور خربوزے۔ اور میں نیند میں چونک
چونک اُٹھا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا جائکی بے پناہ خوبصورت ہے۔ سات پشتیں ریشم
کے کیڑے پال کر جب جاکر ایسے بال حاصل ہوتے ہیں۔ سات پشتیں دودھ بلوہ
کر مکھی نکالتی ہیں، تب جاکر بدن میں یہ نرمی، یہ لوچ، یہ رنگ پیدا ہوتا ہے۔ سات
پشتیں چندن اور زعفران گھوٹتی ہیں، تب جاکر تنفس میں یہ خوشبو پیدا ہوتی ہے
جیا یہ رات بھر تڑپنے کے بعد دوسرے دن سویرے میں جائکی کی دکان پر جا پہنچا کل تم
ناراض ہوگئیں۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ مگر اُس نے مجھے ٹوک
کر کہا۔
ٹھہرو۔ آگے کچھ مت بولنا۔
مگر تم بات تو پوری سُنو جانکی
نہیں۔ میں نے سُن لیا، جو کچھ مجھے سُننا تھا۔ آگے تم کیا کہو گے یہی نا کہ جانکی معاف
کر دو۔ یہی کہو گے نا؟ مگر تمہاری زبان سے یہ جملہ ادا ہو جاتا، تو میں تمہیں زندگی بھر
معاف نہیں کرتی۔ اور میری دکان تباہ و برباد ہو جاتی۔

دن جب میری نظر اس پر پڑی تو میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ صرف ایک لمحے کے لیے
تیسرے دن جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرے سارے سراپا میں ایک سنسنی کی لہر
دوڑ گئی اُس دن میں نے صبح کا کھانا نہیں کھایا۔ چوتھے دن میں نے ہچکچاتے ہوئے کھڑکی
کھول دی۔ سامنے تار سے پرندے کی لاش بدستور لٹک رہی تھی میں دیر تک اس کی
طرف دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اس پرندے کا گانا سنا
ہوگا کتنی بار میں نے اسے اپنے آنگن میں پھدکتے دیکھا ہوگا۔ کتنی بار میں نے اسے اپنے
آنگن میں اونچی اونچی اڑانیں بھرتے دیکھا ہوگا۔ دیکھتے دیکھتے اور سوچتے سوچتے میری آنکھیں
بھر آئیں میں نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور بستر پر آنکھیں بند کر کے پڑا رہا دل پر
ایک ان جانا سا بوجھ محسوس کرتا رہا اُس رات مجھے تیز بخار آیا۔ رات بھر بخار میں تپتا
رہا حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ مگر بستر سے اٹھنے کی سکت نہ رہی اور تو کے جانکی آ گئی ـــ
ادھر کئی دنوں سے میں نے اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرنا شروع کیا تھا چائے ناشتے
کے ساتھ ساتھ جانکی کو بھی آنا پڑا تھا۔ برتن صاف کرنے۔ جانکی کوئی پیشہ ور برتن صاف
کرنے والی نہیں ہے۔ بلکہ نیچے گلی میں بارہ پھلوں کی دکان کرتی ہے دکان تو دراصل اُس کے
باپ کی تھی مگر ایک رات جب وہ حسبِ معمول دیسی شراب کے نشے میں گھر میں داخل
ہوا تو پتہ چلا کہ نشہ کچھ زیادہ ہی تیکھا ثابت ہونے لگا ہے، رات بھر وہ نشے کی تیکھے
پن میں تڑپتا رہا اور صبح ہوتے ہوتے آنا فانا ہو گیا کہ اُسے اٹھا کر چتا پر لٹا دیا گیا
جانکی پر پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس پہاڑ کے نیچے دب کر مر جانے کی بجائے، اُس نے طاق پر
سے دکان کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر آ گئی
بہرحال۔ جب میں نے اس سے اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرنے کی بات کہی، تو اس
نے پیش کش کر دی کہ برتن میں صاف کر دوں گی۔ میں اُس کی اِس پیش کش کو ہنسی میں ٹال گیا
دوسرے دن اُس کا اصرار بڑھ گیا میں نے کہا ایسا ہونا ناممکن ہے۔
کیوں ناممکن ہے؟
کیونکہ میں اکیلا رہتا ہوں، اور کسی ایسے گھر میں، جہاں کوئی عورت نہ رہتی ہو،

ایک پل کے لیے ایسا لگا جیسے روشنی کی ایک تیز کرن آکر میرے سینے میں اُتر گئی ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ آس پاس کی ہر چیز نظر سے اوجھل ہو گئی فقط تیز چمکدار روشنی اور بس۔ نہ کوئی مکان، نہ درخت، نہ پرندے، نہ بجلی کی تاریں کہتے ہیں یہی اندھیرا ہر چیز کو چھپا دیتا ہے۔ پر تیز چکا چوند کرنے والی روشنی بھی تو ہر چیز کو چھپا دیتی ہے۔ اندھیرا سیاہ دبیز چادر میں اور روشنی چمکدار چندھیا دینے والے حریری پردے میں۔ کہیں یہ سب انسان کی اپنی نظر کا دھوکہ تو نہیں؟

میرے مکان کے سامنے گلی میں بجلی کی بہت سی تاریں پھیلی ہوئی ہیں اور ان تاروں میں اٹکی ہوئی پتنگیں، کپڑے کی دھجیاں، دھاگے کے ٹکڑے۔ ایک پرندے کی لاش بھی ایک تار سے لٹک رہی ہے۔ نہ جانے یہ پرندہ کب مرا تھا مگر ابھی تک تار کو پکڑ کر لٹک رہا ہے۔ کئی دنوں سے میں اس پرندے کی لٹکتی ہوئی لاش کو دیکھ رہا ہوں۔

پہلے دن جب میں نے اسے دیکھا تو میں نے کراہت سے نظریں پھیر لیں دوسرے

طوفاں تھم چکا ہے۔ دُور دُور تک رات کے سناٹے گھر آتے ہیں صرف بستی کے
کلس کی کھڑکیوں سے روشنی کی لکیریں چھن چھن کر باہر آ رہی ہیں۔ باہر برف گر رہی ہے
اور اردگرد قریب کی تمام چیزیں برف کی تہوں میں چھپتی جا رہی ہیں۔ میں اس ماؤ نار اور
رحمت جبار کی ایک پھنگ پر بیٹھا ہوں میرے پروں پر سب دھیرے دھیرے جمع
ہوتی جا رہی ہے۔ نیچے جہلم کی سطح پر ڈولتی ہوئی اُس لڑی سی، وقت زدہ سی، بوسیدہ
سی کشتی کے سرے پر وہ بوڑھا ملاح حسبِ معمول بیٹھا اُونگھ رہا ہے۔ اُس رات کے بعد یہ
پھر کبھی نہیں بولا۔

اُس رات جب میں ابھی انسان کی شکل میں تھا، بول سکتا تھا لیکن میں نہیں بولا
میں نے بندوق اپنی کنپٹی سے لگا کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ کیونکہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں اپنی
اولاد کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔

اب میں گدھ بن کر اس جبار کی پھنگ پر بیٹھا آپ کی اولاد کے سوال کا انتظار
کر رہا ہوں۔

موجود نہیں ہے۔

دوربین کا زاویہ تبدیل کر کے کتنی بڑی غلطی ہو گئی۔ اب اس دلدل سے بچ کر کیسے
نکلا جائے مگر اس غلطی میں آپ بھی اتنے ہی شریک ہیں، جتنا میں ہوں۔ آپ بھی دلدل میں
اُتر گئے ہیں۔ میں بھی اُتر گیا ہوں۔

کشتی کے سرے پر بیٹھے ہوئے اس بوڑھے ملاح کا وجود ہی ایسا ہے۔ خواہ مخواہ
گزرے ہوئے وقت کی یاد دلاتا ہے۔ ان لوگوں کی جو اچھے تھے۔ اُن رشتوں کی جو خوشبودار
تھے اُن آدمیوں کی جو انسان تھے۔ اُن غم گساروں کی جن کی پلکوں پر آنسو لرزا کرتے
تھے اب یہ صرف شور مچاتے، لڑتے جھگڑتے، چھینا جھپٹی کرتے گدھ رہ گئے ہیں جنہوں نے
ان اداکار جیالوں کا پتہ نہ جانے کہاں سے اور کیونکر حاصل کیا ہے یا پھر پری نگر کلک
کی پُراسرار راہداریوں میں رہنے یا قدر چلنے والے یہ ہیولے۔ کہیں ـــ ایسا تو نہیں کہ سب
آدمی بہت پہلے مر گئے ہیں، اور اب صرف آسیب باقی رہ گئے ہیں جن کا نہ کوئی ضمیر ہے،
نہ کوئی محبت ہے، نہ کوئی رشتہ ہے، نہ کوئی شرمندگی ہے، نہ کوئی مروت ہے، نہ کوئی سخاوت
ہے، نہ کوئی رحم ہے نہ کوئی زندگی ہے۔

زندگی ـــ؟ یہ لفظ کہاں سے گھس آیا اس تحریر میں؟ ضرور کسی دوسرے سیارے
سے آیا ہوگا۔ کیا میں بھی کسی دوسرے سیارے سے آیا ہوں؟ شاید۔ جبھی یہ اجنبیت کا
احساس بار بار میرے بہت اندر کہیں سر اٹھا رہا ہے مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے میرے
سامنے، میرے آگے پیچھے، میرے اردگرد قریب ROBOTS نہیں ہیں گوشت پوست
کے بنے ہوئے انسان ہیں، جو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔ کبھی رو بھی اٹھتے
ہیں ـــ پھر؟ پھر یہ کیفیت کیوں؟ یہ گدھوں کا شور، یہ پُراسرار ہیولے، یہ ہیبت ناک
مناظر یہ دل خراش وقوعے۔ یہ سب کیا ہے؟ کس سے پوچھوں؟ کون بتائے گا مجھے؟
ہٹا دو اس وقت زدہ دھند میں کو مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے دو۔ اے بوڑھے ملاح
خدا کے لئے تم کچھ بولو مگر تم کچھ نہیں بولو گے۔ تمہیں صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ تم سے گفتگو
نہیں ہو سکتی۔ تم تو فقط ماضی ہو۔ یہ ـــ یہ آواز؟ یہ کیسی آواز تھی؟ زمیں کیوں ہلے

مرحلہ بھی شامل ہے۔ سرداسد سفارش حاصل کرنے میں ماہر ہے۔ چنانچہ ضمانت دلوانے میڈیکل سیٹ دلوانے، گاڑی کا پرمٹ دلوانے، شراب کی دکان کا لائسنس دلوانے میں اس نے پبلک کی بہت خدمت کی ہے، ملک سدرے کو منسٹر ہونا چاہیے تھا نہیں بن سکا ہے۔ شاید صرف اسی کوالیفکیشن کافی نہیں تھی۔ البتہ اُس بیوقوف لڑکی کی کوالیفکیشن کافی تھی۔ بھلا سا نام تھا اُس کا آشا یعنی اُمید۔ اُمید؟ کس بات کی اُمید؟ کیسا بیہودہ سا لفظ ایجاد کیا ہے تہذیب نے۔ اُمید۔ جانے کتنے معصوم، بے چہرہ، بے بس، بے سفارش، بے رشوت، بے رسوخ، بے دولت، بے شفقت، بے گناہ، بے مروت لوگ اس لفظ کا تار تھامے اپنی زندگیاں سولی پر لٹکانے منتظر ہیں۔

آشا نام کی لڑکی بھی منتظر تھی۔ اچانک ایک دن قسمت کی اندھی اور بہری دیوی اُس پر مہرباں ہو گئی، اور اُسے سرداسد مل گیا یا سرداسد کو وہ مل گئی۔ چنانچہ سرداسد کی خدمتِ خلق کی فیکٹری چالو ہو گئی آشا کو اسکول ٹیچر کی ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ پروانہ [illegible] کے پاس تھا۔ سفارش سرداسد کے پاس تھی اور پاکدامنی کا دوپٹہ آشا کے پاس تھا۔ چنانچہ اُس رات اِس دوپٹے کو خوب خوب ہوا میں لہرایا گیا دوسرے دن پوسٹ مارٹم کرنے والی ٹیم کو وہ نوکری کا پروانہ آشا کی بند مٹھی میں ملا تھا۔ نادان لڑکی نے وہ اسٹر کی [illegible] بنا ڈالی تھی، جو اس کی ماں سویٹر بننے کے لئے لائی تھی۔

یہ رنگ سازی کا فن بھی اب ترقی یافتہ معاشرے کا لازمی جزو بن گیا ہے چہرے رنگیے، کیسٹ ڈرا رنگیے، لیاقت رنگیے، کردار رنگیے، ضمیر رنگیے۔ حتیٰ کہ گناہ بھی رنگے جاسکتے ہیں ماہر رنگ ساز کا ملنا شرط ہے۔ مکندلال ورما اس فن کے ماہر ہیں کلب کے اہم رکن ہیں۔ فن کا کمال ایسا کہ بیوائی کو رنگوں کی نوک پلک سے درست کرکے شاعر بنا دیتے ہیں۔ چاقو دھاری لفنگے کو رنگوں کی بھول بھلیوں سے گزار کر لیڈر بنا دیتے ہیں۔ سات پشتوں سے سری بیچنے کا دھندا کرنے والے کو رنگوں کی تہوں میں چھپا کر انٹلیکچول ساکریٹس کرتے ہیں۔ دولت کی انتہا کا ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ دولت سے خریدا جاسکے، خرید لو، اچھا گھر، اچھا خاندان، اچھا کردار، اچھی امیج، اچھے پبلک ریلیشنز۔ دلال تو ہر قماش کے مل ہی جاتے ہیں کسی وصف کا

سارا سارا دن ایسی بوسیدہ کشتی کے سرے پر بیٹھا اونگھتا رہتا ہے کلب کی کھڑکی میں نصب دُوربین سے دیکھیے تو کبھی کبھی مُردہ نظر آتا ہے۔ مگر اس دُوربین کا کیا بھروسہ۔ یہ بھی تو اب بوڑھی ہو گئی ہے۔

چلیے قصّہ کا واقعہ ملنے کے لیے اِس دُوربین کا زاویہ بدل دیں اور اس بوڑھے ملاح کی آنکھوں سے گرد و نواح کا جائزہ لیں۔ ہے تو انہونی سی بات۔ مگر کیا کیجیے، حالات نے انہونی کو ہمت بخشی ہے۔ اب دیکھیے نا مسٹر جاوید کا بیس ہزار وہ سوٹ کیس اگر پہلے ہی سفر میں پکڑا جاتا، تو وہ صرف دس ماہ کے اندر لکھ پتی نہیں بن جاتا۔ آج کی شام وہ کلب کے کارڈ روم میں ابھی تک ستر ہزار روپے ہار چکا ہے اور باہر اس کی جو کس ویگن میں بیٹھا ہوا ڈرائیور اپنے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا ہے جی نہیں۔ یہ عام اصطلاح والا موبل آئل نہیں ہے کچھ پسینہ، کچھ ولایتی عطر کا خمار، کچھ لپ اسٹک کی سُرخی، کچھ تیز سانسوں کا ریڈیم۔ اس موبل آئل کی کیمسٹری کچھ اور ہے کالج کے زمانے میں مسٹر جاوید کا پسندیدہ مضمون کیمسٹری ہی تو تھا

مسٹر جاوید کے پارٹنروں میں، ایک ڈاکٹر ہے، جس کے بارے میں اب بھی ریسرچ کیا جا رہا ہے، کہ وہ موجودہ اعلیٰ عہدے پر اپنی دلکشی اور دل نوازی کے اثر و رسوخ سے، فائز ہوا ہے ڈاکٹر آج دھڑا دھڑ نوٹ جیتتے جا رہا ہے مگر جس رفتار سے وہ جیت رہا ہے، اُسی رفتار سے اس کی بیوی دوسرے ٹیبل پر ہار رہی ہے۔ اس ٹیبل پر سائیکالوجی کا سایہ ہے بھلا ہو سردارنی جسونت کور کا۔ سائیکالوجی کی اتنی ماہر ہے کہ اُس کی نوٹ بک میں درجنوں ٹیلیفونوں کے نمبر بولتے ہیں، ناچتے ہیں گاتے ہیں، روتے ہیں ماہروں کا کہنا ہے ٹیلیفون نمبر زیادہ تر روتے ہی دیکھے گئے ہیں۔ رونے رلانے کا کھیل تو پنڈت سروانند کا من پسند کھیل ہے واقف کار حلقوں کا کہنا ہے، سروانند گنتی جیر ہے مگر تہذیب یافتہ زبان اس لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی پنڈت سروانند کے بے شمار رشتہ دار ہیں، دوست ہیں، واقف کار ہیں مہربان ہیں آج کے زمانے میں ترقی اور خوشحالی جہاں روپے پیسے سے، چاپلوسی سے، اثر و رسوخ سے حاصل ہوتی ہے، وہاں اِن مرحلوں میں سفارش کا

کلب کے ارکان تفریح طبع کے لئے کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دَور میں کے احاطے
میں کبھی کبھی یہ بوڑھا ملاح بھی چلا آتا ہے

روایت ہے کہ چند سال پہلے کسی انگریز نے بھی اس دَور میں سے بوڑھے ملاح کی ٹانگوں
کے ان گرد لشانات کو دیکھا تھا۔ اور ایک میڈیکل پیپر تحریر کیا تھا۔ کانگڑی اور کینسر۔
اس مضمون نے طبی دنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی کہتے ہیں اُس رات چناروں کی اُونچی پھنگوں
پر بسنے والے گدھوں کا خاندان رات بھر روتا رہا تھا اور مری نگر کی کلب کی راہداریوں میں
آسیب اُچھلتے کودتے رہے تھے۔

یہ گدھ اِن چناروں کی شاخوں میں کسی اصلی گدھ کو کبھی نہیں ہونے دیتے۔ بظاہر
دن بھر ایک دوسرے کو چونچیں مارتے دکھائی دیتے ہیں اور اس قدر شور برپا کر دیتے ہیں، کہ سڑک
پر چہل قدمی کرنے والے ملکی اور غیر ملکی سیاح لوٹ جاتے ہیں مگر جونہی کوئی اصلی گدھ غلطی سے
اس طرف نکل آتا ہے، تو یہ سب کے سب اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اُسے لہو لہان کر دیتے
ہیں۔ وقت کے اوراق پر درج ہے کہ ایسے کئی اصلی گدھ، بوڑھے اور جوان، نر اور مادہ دقتاً
فوقتاً جاں بحق ہو گئے ہیں۔

مری نگر کلب کی وقف زدہ راہداریوں میں، گدھوں کی اِس اجارہ داری پر کبھی
کوئی رائے زنی نہیں ہوتی ہے۔ نہ کلب کی ریڈرس ٹنگ میں اِن گدھوں کے بارے میں کسی نے
کوئی جملہ تحریر کیا ہے آدمی بھلا گدھوں کے بارے میں کیا تحریر کرے۔ مُردار کھانے والے، بے ہنگم
صدائیں بلند کرنے والے، ایک دوسرے کی چونچ سے نوالہ چھینے والے کریہہ مردے اجاڑنے والے
سربلند، باحشمت، پُروقار، پُرشکوہ چناروں کا پتہ ان کو کس نے دیا تھا۔

ہاں، وہ کشتی والی بات بیچ میں ہی کٹ گئی اور اُس بوڑھے ملاح کی، جو اس بوسیدہ
کشتی کے سرے پر ٹانگوں میں کانگڑی دبائے اونگھتا رہتا ہے اس جواب آگیں گرد و نواح میں
اِس بوڑھے ملاح کی حیثیت تیسرے درجے کی ہے۔ کیونکہ اس کے کردار میں نہ مری نگر کلب کے
اراکین کی سی توجہی، حکمت، امامت، ذہانت اور حرارت ہے اور نہ ہی چناروں کے پھنگداروں
میں رہتے بستے گدھوں کی چھینا جھپٹی، بے قراری، مکاری، اجارہ داری اور عیاری ہے۔ نامراد

جہلم کے کنارے، ریور سرٹ کے اِس پار سڑک کے پاس چند بوڑھے چناروں کا تالہ
ایستادہ ہے۔ اِنہی چناروں کی اونچی پھنگوں پر سالہا سال سے، گدھوں کا ایک خاندان آباد
رہتے ہیں، یہ گدھ جب رات کو روتے ہیں، تو پاس ہی سری نگر کلب کی حواس اُگس
معاملہ ایسی ساتے منڈلانے لگتے ہیں بظاہر یہ کوئی تشویشناک بات نہیں ہے لیکن
اتفاق کہیے یا ستم کی تقدیر کہ کلب کی عمارت سے کچھ ہی دور سڑک کے نشیب میں، جہلم کی
چھاتی پر ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی سالہا سال سے لنگر انداز ہے، اور جہلم کی روانی کے ساتھ ساتھ
محوِ حرکت ہے۔ اسی کشتی کے ایک سرے پر ایک بوڑھا ملاح، اپنی سوکھی ٹانگوں میں کانگڑی
دبائے اونگھتا رہتا ہے۔

مسلسل کانگڑی تاپتے تاپتے اِس بوڑھے ملاح کی ٹانگوں اور جانگھوں پر لگے لال
رنگ کی پیڑیاں جم گئی ہیں اور ان کی طرف دیکھ کر لگتا ہے جیسے ان گنت زخموں پر وقت
کے بےرحم کالے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان ثبت ہوں۔
کلب کی عمارت کی ایک کھڑکی میں ایک بہت بڑی تصویر نصب ہے جسے

قمت جو استعمال کی گئی تھیں۔ بس سمجھ سترہ سو اسّی روپے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اُس تتلی سی لڑکی کا دل، جو نہ جانے ملک کے کس حصے سے شاید پہلی بار کشمیر کی سیر کو آئی ہے، اسے جب بھی کشمیر کی یاد آئے گی، تو جیتے کا یہ تحفہ اس کی یادوں کے طاق پر ہمیشہ رقص کرنے کے لئے تیار نظر آئے گا۔ اسی لمحے وہ لڑکی پھر دکان کے اندر داخل ہو گئی: "کیا کروں، یہ ٹائیگر کب ہم کو بہت لائک کیا، پیسہ جاستی ہے۔ اپن کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے بہت خرچہ ہے اِدھر کشمیر میں ۔۔ کیا کروں ۔۔ یہ ٹائیگر کب ہم کو ایک دم کل کر دیا ہے؟"

محمد جو کے چہرے پر ایک اُجلی سی مسکراہٹ کھِل اُٹھی۔ "معلوم ہے بی بی۔ سب سمجھ گیا ہوں۔ پر کوئی بات نہیں۔ ہم تم کو یہ ٹائیگر اب بالکل کاسٹ پرائس پر دے گا ہم نے حساب لگایا ہے۔ خالی میٹریل کا کاسٹ ۔۔۔ سمجھ گئی نا۔ خالی سترہ سو اسّی رُپیے تمہارا دل خوش ہو جائے گا، ہم سمجھیں گے ہمارا خدا خوش ہو گیا۔"

کیا بولا ۔۔ یہ ایک تھاؤزنڈ سٹ کمی ۔۔ باپ رے، ایک ہی بات میں ایک تھاؤزنڈ سٹ کمی، اپن کو دیس میں بولا تھا، اُدھر سب چیٹ ہے ۔۔ سچ بولا تھا۔ پانچ سو روپے لیا تو بات کرو ۔۔

آہستہ آہستہ محمد جو نے اِن لفظوں کو اپنے کانوں میں اُترتے سنا۔ آہستہ آہستہ ہی اِن لفظوں کی تلخی اُس نے اپنے اندر بہت اندر اُترتی محسوس کی۔ اُس نے حیران حیران سی نگاہوں سے اُس دھان پان سی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پانچ سو روپیہ لیا تو بات کرو۔ اِدھر سب چیٹ ہے۔ پہلے جاستی دام بولتا ہے پھر بارگیننگ کرتا ہے۔ پھر سب گنتی میں چیتا ہے۔ محمد جو نے کچھ کہنا چاہا، اُس کے ہونٹ تھرتھرائے، مگر کوئی آواز نہ نکل سکی۔ میرے خدا! یہ ہونٹوں کی خاموش تھرتھراہٹ اتنے برسوں کے بعد؟

اُس نے ڈھیر سے کاغذ کا وہ پرزہ اُٹھایا، جس پر اُس نے ابھی

اُس کا دل بھی کبھی کبھی پلیٹینم ٹاکیز میں فلم دیکھنے کے لئے مچلتا تھا۔ مگر اب ایسی اس چاہت
کو وہ ایک چاند میڈ مشکل سے اینٹ میں ٹال کرتا تھا۔ اب وہ اٹھارہ انیس برس کا صمد نہیں تھا
ستاون یا اٹھاون برس کا بعد تاد میں رکھتا تھا۔ حاجی صمد جو کار دو رے کا یا مد
اُس نے آخری بار چیتے کے بچے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور آ کر اپنی گدی پر بیٹھ گیا اس
چیتے کے بچے کو اُس نے پچھلے سال اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ حالانکہ یہ کام اب اُس کے
دوسرے کاریگر اور ملازم کیا کرتے تھے۔ مگر نہ جانے کون سا لمحہ تھا وہ، جب اِس چھوٹی سی
کھال کو دیکھ کر، اُس کے اندر چھپا ہوا فنکار جاگ پڑا تھا۔ اور۔ اور آج یہ لڑکی، جو اب
تک تین بار اُس کی دکان کے چکر لگا چکی تھی، اُس کے فن کے آگے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی
صمد جو نے حقے کی نے ہونٹوں میں دبا لی اور ہلکے ہلکے دھوئیں کے سائے میں اِس لڑکی
کے بارے میں سوچنے لگا۔ دھان پان جسم، کمر کے نیچے تک لمبے بالوں کی دو چوٹیاں اٹھارہ
انیس برس کی لگتی تھی ۔۔ ہاں! اس عمر میں کوئی حیران کن چیز دیکھ کر ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں
اور آواز نہیں نکلتی بالکل ایسے اِس عمر میں اُس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بیچاری معصوم لڑکی!
چاند کو ہتھیلی پر اُتارنے کی تمنا۔ مگر جب ایک معمولی آئینہ بھی پاس نہ ہو، تو چاند کتنا دور لگتا
ہے نگاہ سے دور، دسترس سے دور، مگر خیالوں کے پاس ہونٹوں کی بے آواز تھرتھراہٹ
کے اریب قریب!

سوچتے سوچتے اچانک صمد جو کو خیال آیا کہ شاید اِس لڑکی کے پاس اتنے پیسے ہی
نہ ہوں کہ وہ اپنے خیالوں کے اِس چاند کو خرید سکے۔ کیا عجیب سا لگتا ہے جب دل ایک
طرف کھینچتا ہو، مگر جیب دوسری جانب گھسیٹ کر لے جاتی ہو۔ محرومی ہے۔ لاچاری ہے؟
مجبوری ہے؟ آدمی کا اپنے آپ پر سے اعتماد ہی اُٹھ جاتا ہے ۔۔۔۔ یہ بہت بڑا
گناہ ہے۔

صمد جو نے سامنے پڑی ہوئی میل اور کاغذ کا سہارا لیا۔ وہ حساب لگانے لگا
منافع نکال دو۔ بہت کچھ دے رکھا ہے اللہ پاک نے محنت کی اُجرت بھی لی گر دست
اُسی کرت جلیل کا فضل ہے۔ صرف لاگت کا حساب کھال کی قیمت، دوسری چیزوں کی

سمجھ کر لے'
لڑکی نے اُس کی قیمت پوچھی تھی، تو محمد جو نے قیمت بتا دی تھی۔ دو ہزار سات سو
اسی روپے! قیمت سُن کر لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ صرف ایک جھجک کے ساتھ اُس
چیتے کے بچے کی کمر پر ہاتھ پھیرا تھا اور دکان سے باہر چلی گئی تھی۔
یہ کوئی گیارہ بجے کے قریب کی بات تھی۔ دو بجے دن کے وقت جب محمد جو دکان
کے اندرونی حصے میں کھانا کھانے کی غرض سے جانے کی سوچ رہا تھا، تو یہ لڑکی پھر دکان کے
سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے چیتے کے بچے کی طرف دیکھ کر جھجکتے ہوئے
قدموں سے آگے نکل گئی تھی اور ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ لڑکی تیسری بار دکان کے سامنے
سے گزر گئی تھی اور اُس کی نظریں اُس چیتے کے بچے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اُس کے لب تھرتھراتے
تھے، لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔
چیتے کے بچے کے بالوں میں بے خیالی سے اُنگلیاں پھیرتے پھیرتے محمد جو کو ان تھرتھراتے
ہونٹوں کا خیال آیا اور پھر خیالوں کی یہ روپہلی لکیر وقت کے پردوں کو چیرتی ہوئی دُور
پیچھے چلی گئی۔ جب وہ اٹھارہ اُنیس برس کا نوجوان تھا، اور جب اُس کا آبائی مکان آگ
کی نذر ہو کر خاکستر ہو گیا تھا، اُن دنوں ہر خوبصورت مکان دیکھ کر اُس کے ہونٹ اسی
طرح غیر ارادی طور پر تھرتھرایا کرتے تھے یا جب اُس نے پہلی بار ایک دودھیا رنگ کی
شیورلیٹ کار دیکھی تھی۔ یا جب اُس نے پلیڈیم ٹاکیز میں پہلی بار سلوچنا چیٹرجی کو کسی فلم میں
دیکھا تھا کیسی تھرتھراہٹ تھی اس میں، کیوں اِن موقعوں پر اُس کے ہونٹ تھرتھراتے
تھے؟ آج اتنے سارے سال گزرنے کے بعد بھی محمد جو اپنے ہونٹوں کی اُس بے آواز تھرتھراہٹ
کے معنی نہیں کھوج سکا۔ زمانہ بیت گیا تھا تب سے۔ آج گرگل باغ میں محمد جو کا شاندار
مکان تھا۔ اُس کے گیراج میں دو موٹریں موجود تھیں۔ وہ ہر اتوار کو اپنے دونوں پوتوں یاسین
اور انوار کو گگری بل میں گھنٹوں موٹر بوٹ کی سیر کراتا تھا انہیں کبھی براڈوے میں، کبھی خیام
میں، کبھی فردوس میں فلم دکھانے لے جاتا تھا اور اُن کے معصوم سُرخ لبوں کی طرف دیکھتا رہتا
تھا۔ کہیں کسی بے آواز تھرتھراہٹ کا سایہ تو نہیں ہے۔

گورڈن صاحب [illegible] اپنی سنگار اینڈ کمپنی نامی دکان بڑھا کر ولایت واپس چلے جانے
کی سوچ [illegible] اتفاق سے یہ خالی دکان صمد کو مل گئی۔ پانچ چھ مہینوں کے بعد اس دکان پر
بورڈ لگ گیا۔ صمد اینڈ سنز فریئرس اینڈ سکن ڈرمیٹ۔ اور یہ بورڈ اتنا مشہور ہوا
کہ ابھی تک ولایت سے آنے والے سیاح سرینگر میں اس بورڈ کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔
کچھ صمد کی فنکارانہ مہارت کا کرشمہ تھا، کچھ اس کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا اور کچھ
اس کی سادگی پسند طبیعت کا اثر تھا کہ صمد اینڈ سنز کی دکان ایسی چل نکلی کہ بڑی بڑی
بڑی دکانیں اس کی رونق کی چکاچوند سے ماند نظر آنے لگیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد صمد صاحب
حیثیت اور صاحب جائیداد تاجروں میں شمار کیا جانے لگا۔

صمد جو نے اٹھ کر دکان کے اندر اخروٹ کی منقش تپائی پر رکھے ہوئے چیتے کے بچے
کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا، پھر سیسے کی سی ہوئی ان آنکھوں کی طرف دیکھا، جو اس نے
نہایت فنکاری کے ساتھ اس کے چہرے میں فٹ کی تھیں پھر اس کے منہ پر لگائے ہوئے
ان بالوں کو دیکھا جو ایک ایک کر کے بہت احتیاط کے ساتھ اس نے مسوڑوں میں
لگائے تھے پھر انگلی سے اس کے منہ کے اندر لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر نوکیلے دانتوں
کو چھو کر دیکھا۔ ہاں واقعی چند قدم کی دوری پر ہر دیکھنے والے کو چیتے کا یہ بچہ ایسے نظر
آئے گا، جیسے ابھی یہ اپنا دہانہ کھولے آگے بڑھائے گا اور جست لگا کر اس اخروٹ کی تپائی
سے کود پڑے گا۔

اس لڑکی کو بھی دکان کے باہر ایسا ہی نظر آیا ہوگا جبھی تو وہ دکان میں داخل ہو کر
بے حد محتاط انداز میں، ڈرتے جھجکتے اس تپائی کے پاس چلی گئی تھی۔ اور پھر اس کے منہ
سے ایک عجیب آواز نکلی تھی جو نہ چیخ تھی، نہ کلمۂ حیرت تھا، نہ اظہارِ مسرت تھا ایک
عجیب سی آواز تھی جو شاید ہر بچے کے منہ سے نکلتی ہے، جب وہ پہلی بار سورج کو طلوع ہوتے
دیکھتا ہے۔

پھر اس لڑکی نے ڈرتے جھجکتے صمد جو سے پوچھا تھا یہ بیچنے کے لیے ہے یا دکان کی ڈیکوریشن
کے لیے۔ اور صمد جو نے منقش چلم جماتے ہوئے، پیتل کے حقے کی نے منہ سے نکال کر کہا تھا

ساتھ دستخط کیا کرتی تھیں۔ انگریز مرد تو صمد جو سے STUFFED جانور اور پرندے بہت
شوق سے خریدا کرتے تھے۔ چیتے، بارہ سنگھے، مارخور اور طرح طرح کے پرندے ہوکر سری
مرغابیاں، اوڑ کے راج ہنس ڈل جھیل کی رام چڑیا، اسپل کی بلبلیں۔ مردہ جانوروں کی کھال کو
میں بھُس بھرنے کا فن صمد جو نے اپنے باپ رمضان جو سے سیکھا تھا۔

رمضان جو ان پڑھ تھا لیکن خدا نے اس کے ہاتھوں میں ایسا جادو بھر دیا تھا کہ
لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اور لوگ بھی کون! انگریز
جو دوالگ ملک تھے اور سات سمندر پار سے تعلیم، علاج، دوائیاں، ایجادیں کے سکے اور
مکارانہ نظام حکومت لائے تھے۔ کہا جاتا ہے ایک انگریز کپتان نے خوش ہو کر رمضان جو
کو ایک دستخطی سرٹیفکیٹ دیا تھا، جس میں لکھا تھا اگر رمضان جو لندن میں ہوتا تو
بادشاہ جارج پنجم نے اس کا آرٹ دیکھ کر اس کو سر کا خطاب عنایت فرمایا ہوتا۔ افسوس
کہ یہ سرٹیفکیٹ اس آگ کی نذر ہو گیا تھا جس نے ایک منحوس رات کو رمضان جو کے مکان
کو چند گھنٹوں میں راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ اس وقت صمد جو کی عمر اٹھارہ برس کی تھی اور دوسری
جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اس آگ نے تو صمد جو کے باپ کی کمر ہی توڑ دی، اور ساتھ میں حاجی
اسمٰعیل کی کمر بھی توڑ دی تھی، کیونکہ رمضان جو حاجی اسمٰعیل کا چہیتا کاریگر تھا۔

بہرحال رمضان جو نے اپنے بیٹے صمد جو کو اس ہنر کے تمام اسرار و رموز سکھا دئے
تھے، اور صمد نے آگے چل کر اپنے باپ اور استاد کا نام روشن کیا۔ شہر کے دکاندار حلقوں
میں یہ بات مشہور تھی کہ ایک دن صمد کے ہاتھ کا بنا ہوا سنہری کلغی والا جنگلی مرغ دیکھ کر
ایک انگریز کرنل کی جوان لڑکی نے جذبات سے اس کے کھردرے، میلے کچیلے ہاتھوں کا بوسہ
لیا تھا۔ صمد زیادہ دنوں تک اسمٰعیل جو کا کاریگر بن کر نہ رہ سکا کیونکہ تیر دن کے دام ایک
دم بڑھ گئے تھے، اور اس کا آبائی مکان جل چکا تھا اور گیلی لکڑی کے کڑوے کسیلے دھوئیں
سے اس کی ماں کو دمہ کی بیماری لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر انس کی فیس ملک کاک وردار اور احد جو تہدار
جیسے رئیس ہی ادا کر سکتے تھے۔ صمد مال بنا کر پہلے تو مختلف دکانداروں کو دیتا رہا، پھر گگری بل
کے ہاؤس بوٹوں میں رہنے والے انگریزوں کو بیچتا رہا۔ پھر ملک آزاد ہونے سے پہلے جب

درد کا مارا

جب لڑکی تیسری بار اُس کی دُکان کے سامنے سے گزر گئی، تو صمد جُو نے حُقّے کی نے مُنہ سے نکال کر اُس چیتے کے بچّے کی طرف دیکھا، جو دُکان کے اندر اخروٹ کی لکڑی کی منقش تپائی پر کھڑا جیسے اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ صمد جُو کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ ایک اُداس سی کیفیت میں تبدیل ہو گئی۔ اُداسی کا یہ مہین سا سپید دوپٹہ اُس کے وجود پر لہراتا رہا اور آہستہ آہستہ اُس کے وجود کو ڈھکنے لگا جیسے جنوری کی یخ بستہ راتوں میں برف کے گالے دھیرے دھیرے درختوں کو ڈھک دیتے ہیں۔

بنڈ پر صمد جُو کی دکان اُس زمانے سے تھی، جب موجودہ ایمپوریم کی شاندار عمارت میں انگریز ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ جب شام کو انگریز مرد اور عورتیں بنڈ کی سیر کیا کرتے تھے اور سری نگر کلب میں رات گئے تک فوکس ٹراٹ اور والٹز کی دھنیں سنائی دیتی تھیں۔ اُس زمانے میں بھی صمد اینڈ سنز، فریئرس اینڈ ٹیکسی ڈرمسٹ کی دُکان مشہور تھی اور انگریز عورتیں اس دُکان میں سمور کے ملبوسات کے آرڈر بک پر بہت جاؤ کے

آرتی کا تھال اُٹھائے ہوئے شہر کے دروازے پر اُن کا انتظار کرتی رہی۔

میں بھی اُن کا انتظار کروں گی —— ننھی سلو نے بعد میں ہی کہا اور دادی اماں نے دیکھا کہ اُس کے ننھے سے چہرے پر سچ پھوٹ رہا ہے۔

●●●

اِدھر محلّہ زرگراں کا رشید خان الیاس مکھیلے ہے جو آج کل لوہے کے
کوٹھے مشکانے پر ناول لکھ رہا ہے ۔۔۔ آج ایک جانثار سپاہی کو بزم دیر
جگر کا تمغہ عطا کیا گیا۔ اس نے ایک چینی کمانڈر کو تھیلے میں بند کر کے دریائے
چناب میں بہا دیا۔

وہ نادر محلّے کا کستوری لعل ہینگوتے ہے۔ آپ نے حال ہی میں
کو کا یسڈت پر ایک مدلّل کتاب لکھی ہے، اور آج کل "رتی رقص"
لکھ رہے ہیں ۔۔۔

اچانک بادشاہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے دادی اماں کے پوپلے
مُنہ پر ایک چانٹا رسید کیا اور اپنے مصاحبوں کو حکم دیا کہ شہزادی
کا سر قلم کیا جائے۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔
شہزادی زار و قطار رونے لگی۔ میں اُرملا ہوں، مجھے بچاؤ۔
۔۔۔ وہ چیخ رہی ہے ۔۔۔ مگر پال جیتول کے محاذ پر ایک چینی کو مُرچ
مرچیں کھلا کھلا کر اُدھ موا کر رہا ہے ۔۔۔۔۔ اکڑوں دکھا رہے
ہو ۔۔۔ ۹ امیوری کہیں کے ۔۔۔ پرلو ایموں کی گولی اور توٹ جاؤ لیے
دلیں۔

میاؤں ۔۔۔ دُور ایک کونے میں بلّی جرجر کرنے لگی ہے۔
گرفتار کر لو انھیں ۔۔۔ بادشاہ حکمؔ دیتا ہے اور پی۔ ٹو کیع میں
بیٹھے ہوتے ٹی، ایس ایلیٹ اور اس کے شاگردوں کو اور موپاساں
کو اور کستوری لعل ہینگوے کو اور رشید خان مکھیلے کو گرفتار کر لیا
جاتا ہے۔

پھر کیا ہوا، بچّی سلوبید میں بڑبڑائی۔
پھر یہ ہوا میری بچّی، کہ بھارت ورش ایک بار پھر سے
آزاد ہوا، اور سورماؤں سے فتح یاب ہو کر آتے اور شہزادی

آپ آتے تو دید ہو جاتی
آپ جاتے تو عید ہو جاتی

مجھے سخت غصہ آنے لگا ہے اور میں پال کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ پال کو بھی سخت غصہ آنے لگا ہے۔ ہم دونوں دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جو غزل کے ایک شعر پر ایسی کرسیں شو شو کی داد دے رہا ہے۔ اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے غصب ہو جاتا ہے۔

چھت سے لگا ہوا پنکھا ماہر جیالے کی طرح غوطہ لگا کر ہم سب کے سر اڑا دیتا ہے۔ میرا سر اچھل کر لڑھکتا ہوا شہر کے باہر فصل میں سے ہوتے دروازے سے ٹکرا جاتا ہے اور شہید ہو جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عورت سر کے بل کھڑی ہو گئی ہے۔ ایک ٹیبل لڑھکتے لڑھکتے دروازے سے نکل کر سڑک پر آ جاتا ہے اور ایک کار اس کی زد میں آ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ دل ریزہ ریزہ کروا دیا۔

اے لو وہ چائے کی کیتلی میں پڑا ہوا مویاساں کا سر لہولہان ہو گیا ہے۔ لہو کا دھیان رو۔ ٹی ایس ایلیٹ ہیجڑے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے لگا ہے۔ دھن ڈالو، دھن دو ــــــ حضور! یہاں تو مشاعرہ ہو رہا ہے ــــــ پر دھن کے بھگوان ــــــ ایک شاعر تیسی نکال کر داد دے رہا ہے۔

یہ رہیں پیڈ کا چرن داس عرف ٹی، ایس ایلیٹ ہے۔ جس کے ساڑھے چار سو شاگرد ہیں اور جو ہر شاگرد سے پانچ روپے ماہوار وصول کرتا ہے ــــــ وہ تلوتالاب کا جپال سنگھ المعروف مویاساں ہے جو ایک کہانی کا پلاٹ ڈیڑھ سو روپے میں خریدتا ہے، دیس کو اس وقت اُس کی ضرورت ہے، کوئی رہنما ریڈیو کے ذریعے قوم سے خطاب کر رہا ہے۔

کے ایک مصاحب نے اُن ایڈیٹوں کا قصہ بیان کیا جھوں نے اپنے دوستوں کے مکان میں تھوں مارا تھا۔

جل موہر سے یاں لیتے ہیں، پال نے مجھے بازو سے پکڑ کر مس نے جیسے موہر کی چکیلا پیتل کی تھالی میں ڈال دیئے۔

میں نے کہا حضور آپ کی عقل کہاں گھاس چر رہی ہے۔ ایک ڈریس سوٹ نے ایک جواہر جیکٹ سے سوال کیا، جس نے غلطی سے ڈریس سوٹ کے تیلوں پر پیک کی پچکاری ماری ہے۔ آئی ایم سوری، جواہر جیکٹ لحاحت کے مارے یاں پر منہ مارنے لگا، نامہ بریاں مارنے لگا چلو چلو! اندر لڑائی ہورہی ہے۔ نورے نے اپنے کولہے مٹکاتے ہوتے پال کو گھسیٹنا شروع کیا۔

کہاں لڑائی ہورہی ہے؟ کون لڑائی ہورہی ہے؟ کیسے لڑائی ہورہی ہے؟ پال کے چہرے پر اُداسی کے بادل چھاگئے۔

نورے نے ٹی۔ٹوکی طرف اشارہ کیا۔ اور اپنی گردن کو ایک ایسی جنبش دی کہ پال دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ نورے نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی اپنے کیلے ہونٹ پر جادی اور ترپیلے انداز میں کہا۔

میری دھت سے بور ہوری ہے تا۔

دھت تیرے کی اس لڑائی کی وجہ ایک میحڑا ہوا اس لڑائی کی خبریں کبھی ریڈیو سے مت سنا کرو۔

چلو چلو!! اس سے پہلے کہ برات بالکل سامنے آجائے، مٹرک کو یاد کرد۔ پال نے مجھے ٹہوکا مارا اور ہم ٹی۔ ٹو میں داخل ہوگئے۔

ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ جیتول پر ہماری فوجوں کی ٹکر جیسی فوجوں سے ہوئی۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا جس میں دشمن کا بہت جانی دمالی نقصان ہوا اور میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ ریڈیو دھمے سُروں میں اعلان کر رہا ہے اور لوگ تالیاں بجا رہے ہیں، اور ایلیٹ اپنی تازہ غزل کے شعر سنا رہا ہے۔

اور سسکیاں بھرا کرتی تھی۔ ایک دن جوہڑ کے ایک مالک مینڈک نے سوہنی کو آنکھ ماری
اور پھر سوہنی کو اس مینڈک سے عشق ہو گیا اور ایک دن جب وہ دونوں مل کر بیاہ کیا
گڈا گیا گا رہے تھے تو سوہنی کا باپ سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے
سوہنی سے کہا کہ کل صبح جو پہلا آدمی پتوال میں داخل ہوگا، تیرا بیاہ اسی کے ساتھ کر دیا
جائے گا۔ مینڈک نے جب یہ سنا تو وہ پھدک کر جوہڑ کے پانیوں میں غوطہ لگا گیا اور
پاس ہی کہیں گم بیٹھ گیا۔

پھر کیا ہوا؟
ننھی سلونی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح اپنی ننھی سی انگلی اپنی ننھی سی ٹھوڑی پر رکھ کر
دادی سے پوچھا اور دادی اماں نے اپنے پوپلے منہ کی پوٹلی کو کھولا — ہاں تو سنو بیٹیا
راج کرے، پھر یہ ہوا کہ شہزادی نے وہ رات آنکھوں میں کاٹی۔ اُدھر محل سرا میں شہزادی
کی اماں بادشاہ کی بڑی منت سماجت کرنے لگی اور کہنے لگی، عالم پناہ! اپنی اکلوتی بیٹی
پر رحم کر!

یہ عالم پناہ کیا ہوتا ہے دادی اماں؟ — ننھی سلونی نے حیرت سے پوچھا اور دادی اماں
اداس ہو گئیں۔ سخت اداس ہو گئیں — ننھی سلونی نے چپ چاپ ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ
مار دیا اور دادی اماں [illegible] بجنے لگا۔ دادی اماں [illegible] خوش ہو گئی۔
اور اس نے دوبارہ اپنے پوپلے منہ کی پوٹلی کو کھولا — ہاں تو سلونی راج کرے! اُدھر
یہ ریکارڈر بجتا رہا اور اُدھر عالم پناہ نے شہزادی کی اماں کو خوب ڈانٹ بتائی۔
اے کیا سوچ رہا ہے پتوال کے —— بس بس، آگے کچھ مت کہنا۔ میں نے پال کے
منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور [illegible] کے پر گھڑی اس شہزادی کو آخری بار
دیکھنے کے بعد پال کے ساتھ روانہ ہو گیا۔
اتنی دیر میں کیا دیکھتا ہوں صاحبو کہ حدِ نظر تک ایک لق و دق صحرا ہے اور
صحرا میں نرم نرم دوب اگی ہوئی ہے اور اس دوب پر کچھ چوپائے قسم کے جانور
منہ مار رہے ہیں۔ میں نے پوچھا اے گھاس منڈی کے صاحبو یہ ماجرا کیا ہے کہ گھاس منڈی

ایسے دل کو بہلاتے رہتے ہیں۔ انگلیاں دُکھنے لگتی ہیں مگر مُٹھی کوئی نہیں کھولتا۔ کوئی کیسے مُٹھی کھول سکتا ہے؟ سب کو معلوم ہے کہ اگر مُٹھی کھولی جائے گی تو اندر وہ لمحہ موجود نہیں ہوگا۔
بھلا لمحے رُکتے ہیں؟ بند ہوتے ہیں کسی کی مُٹھی میں؟
ایک لمحہ بھلا وقت کے ساتھ کیا اُلجھے ــــ

یہاں کسی کے ساتھ باتوں میں اُلجھ گیا ہے اور میں گھاس منڈی کے ناکے پر جواہ مخواہ کھڑا سوچ رہا ہوں آؤ اتھوڑی سی گھاس ہی چرآئیں ــ ہائے اوہ راحیدر مادار کے ناکے پر ایک شہزادی کھڑی ہے۔ تم اس ناکے پر کھڑی کھڑی کیا سوچ رہی ہو شہزادی؟ آؤ کہیں چل کر ایک ایک گلاس بیئر پی کر بہک جائیں اور پھر تم جذباتی انداز میں میرے سینے پر اپنا سر رکھ کے ہلکی ہلکی سسکیاں لینا۔ جانے ان لڑکیوں کو سسکیاں لینے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ ابھی اس دن ملکہ اس رات جس میں اوپر چھت پر اپنی معشوقہ کے ساتھ چاند نگر کی سیر کر رہا تھا، تو کیا ہوا کہ اچانک وہ میرے کندھے پر اپنا سر رکھے ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا، کیا ہوا؟ تو اس نے بڑے پیار کے ساتھ کہا کچھ بھی تو نہیں۔ پھر تم سسکیاں کیوں لے رہی ہو؟ کیوں؟ اس میں کیا بُرائی ہے۔ یہ تو پیار ہی کی ایک نشانی ہے۔ اُس نے بڑے بھولے انداز میں کہا ــ

بہت تیرے کی۔ نکلی نہ آخر معشوقہ ہی۔ زبان سے پیار کا ایک بول ادا نہیں ہوسکتا تو یہ کام سسکیوں سے لیا جاتا ہے۔ چل ہٹ یہاں سے سوہنی کی اولاد ابھی بھلی چاندنی رات کا مزہ کرکرا کر دیا۔
دیکھا یاں پیارے! یہ عشق کا معیار ہے اور یہ وہ معشوق ہیں کہ جن کے لیے تم نے دل کا دورہ خرید لیا ہے۔ نیچے گلی میں کوئی جھوم کر لہک لہک کر گا رہا ہے ــــ "یاد کیا تو آہیں بھرا کیا ــــ دھت تیرے کی! یاں میری پیٹھ پر ایک دھپ لگا کر کہہ رہا ہے۔ اے پوتوال کے ڈوڈو! تم یہاں کھڑے ہو؟ اور میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلکان ہوگیا ہوں ــــ
پوتوال ایک گاؤں ہے جس میں ایک سوہنی رہا کرتی تھی۔ یاں مجھے سمجھا رہا ہے اور پوتوال کی سوہنی ہر رات پوتوال کی اکلوتی جو ہڑ پر مینڈکوں کا تماشا دیکھنے آتی تھی۔

ماں گے، تہر کا دروازہ تو بند ہے۔ میں نے کہا چلو بازاروں کے چکر لگاتے ہیں کیونکہ ملازمیں
یں ہرادیاں ماری ماری پھرا کرتی ہیں۔ کون جانے کب کسی تہرادی کی نظر ہم پر پڑے اور
دے پیارے ہو جائیں پاؔل حلافِ معمول آمادہ ہو گیا اور ہم بازاروں کی غلام گردش
داخل ہو گئے دفعتاً ایک سیاہ اچکن پال کے ساتھ ٹکرا گئی۔ جانتے ہو یہ تیل کا بادشاہ
اس کے پاس ٹنوں تیل بھی ہے اور اس کے گھر میں ایک رادھا بھی منتظر ہے مگر رادھا
ں ناچے گی راجہ کی آنے کی برات۔ یہ ٹنوں تیل کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ جو بازاری
ل بند ہے۔ رادھا کیسے ناچے گی؟
یہ واقعی بڑا نازک مسئلہ ہے یعنی یہ نورآ عرف نورالدین اپنے کولہے مٹکاتا روز
ا ٹو میں داخل ہوتا ہے اور پھر ٹی ایس ایلیٹ سرگوشیوں میں اپنے شاگردوں کے ساتھ
دلی راز و پیار کی باتیں کرتا ہے۔ ہیمنگوے کا کہنا ہے کہ یہ ایلیٹ سالا لونڈا کو اپنا شاگرد بنانا
چاہتا ہے مگر بات دراصل یہ بھی نہیں ہے۔ بات وہی ہے جو موپاساں نے اس دن کہی تھی کہ
اس معاملے کی تہ میں حسن کارفرما ہے۔ بچہ آم چوستا ہے تو کیوں؟ لونڈا اپنے کولہے مٹکا کر
چلاتا ہے تو کس لئے؟ مائی ڈیر واٹسن یعنی ہیمنگوے! یہ سب اس لئے ہے کہ ــــ وہ [illegible]
ایلیٹ کی محبوبہ جا رہی ہے۔ پال مجھے ٹہوکا مار کر ایک عورت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور میں
دیکھتا ہوں۔ اے ایلیٹ میاں! تیری محبوبہ تو بوڑھی کھوسٹ ہی ہو سکتی ہے۔ ایلیٹ کو
غصہ آ رہا ہے کیا کہا؟ وہ بوڑھی کھوسٹ ہے؟ ارے، وہ تو ہارڈی کی ٹیس ہو گی ــــ پال
اچانک قہقہہ مار کر میرے کندھے پر ہاتھ مار دیتا ہے۔
کیوں؟ کیا ہو گیا؟
وہ دیکھو! اس دکان میں کوئی مزدور سیٹھ کی گدی پر بیٹھا لیمپ کا سگریٹ پی
ہائے ہائے میرے پیارے پال! تم بھی کتنے بھولے ہو۔ ایک کھلونا دیکھا اور بہل گئے۔
پیارے ایک لمحے کے لئے اگر وہ سیٹھ کی گدی پر بیٹھ بھی گیا تو کیا واقعی سیٹھ بن گیا ایک
لمحے کے لئے جادو چل گیا ہے اگر ــــ
یہ ایک لمحہ تو ہم سب لوگوں کی زندگی میں آتا ہے اور ہم اسے مٹھی میں دبائے

ہی چلا آ رہا ہے۔ خواجہ سرا کی اولاد آہستہ آہستہ یہ بات خواہ مخواہ بیچ میں آ جاتی ہے
ذکر تو شہزادی کا ہو رہا ہے۔

ہائے! میری شہزادی! تم بادشاہ کو غصہ مت دلایا کرو۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا
اب تم اس رات کو گزر جانے دو۔ کل صبح جب شہر کا دروازہ کھلے گا۔ مگر کل تو منگل وار ہے
اور منگل وار کے دن ہی ٹوکیے کا دروازہ نہیں کھلتا۔ ناغہ ہوتا ہے۔

عجیب اتفاق ہو گیا۔ اتفاق ہو گا، جانے یہ اتفاق کیسے ہو جاتا ہے جیمز جوائس
کا کہنا ہے۔ اے لو! میں پھر بہک گیا۔ بات منگل وار کی ہو رہی ہے۔ جب وہ اتفاق ہوا
اور مجھے پال مل گیا۔ یہ پال بھی عجیب آدمی ہے۔ جب دیکھو دروازے کے پاس ہی ملتا
ہے، اور وہ بھی صبح ہی صبح۔ کون جانے کس دن بادشاہ کو بہت غصہ آ جائے اور وہ شہزادی
سے کہے۔ مگر یہ غلط ہے بادشاہ کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ پال کا کہنا ہے کہ جب وہ بادشاہوں
کے سامنے اُن کو بُرا بھلا کہتا ہے تو ان کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ اس سلسلے میں وہ کاغذ کے بادشاہ
کی مثال دیتا ہے جس کی کاغذی فوجوں میں ایک ہزار غلام بھرتی ہیں اور دریا کے بادشاہ
کی مثال دیتا ہے جو ملک بھر کے تمام ہواڑیوں کو پانی سپلائی کرتا ہے، اور اینٹ کے بادشاہ
کی مثال دیتا ہے جس نے جگہ جگہ اینٹوں کے بھٹے اور کارخانے قائم کئے ہیں اور جو ہر عمارت
کی اینٹ سے اینٹ بجاتا ہے۔ مگر یہ محاورہ اب پُرانا ہو چکا ہے جس طرح بادشاہوں
کا غصہ پُرانا ہو گیا ہے۔ اب بادشاہوں کو کبھی غصہ نہیں آتا اور یہ شہزادی صبح سویرے
دروازے کی طرف آنکھیں لگائے امید و بیم کی منزلوں سے گزرتی ہے اب شہزادی
کو یقین ہے کہ ٹیپو سلطان زندہ ہو کر لوٹ آئے گا اور بادشاہ کو ایسا محسوس
ہو گا جیسے اُسے ایک پیادے نے مات دی ہو یا جیسے کھیلنے کو اپنے پال نے تحت میں
ہرا دیا ہو۔ یہ پال بھی عجیب آدمی ہے، کھیلنے کو تحت میں ہراتا ہے اور ایک معمولی لڑکی
کو بیر دس سا دیتا ہے اور لوگ آدمی کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مگر لوگوں کو دراصل نہیں
معلوم کہ آدمی اصل میں آر ملا ہے اور ـــ جانے دو جی، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بات
تو اُس اتفاق کی ہو رہی ہے جب ہی۔ ٹوکے باہر مجھے پال مل گیا کہنے لگا، اب کہاں

پھر ایک دن بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور اس نے تہرادی سے کہا کہ وہ
اں کا بیاہ اُس آدمی سے کرے گا جو کل صبح سب سے پہلے شہر کے دروازے میں داخل ہوگا
یہ سنکر اندر محل خانہ میں کہرام مچ گیا۔

اب شو تھیٹر ختم ہو گیا ہے۔ اکی اکی نئی، ایس ایلیٹ اور اس کے تماگرد آڈینس
کیلئے، حیرجوانس، موپاساں، اینگوتے وغیرہ یہاں سے اٹھ کر چلے گئے ہیں اور وہ کونے والی
مرکٹی ہوئی میوہ کی طرح منہ کھولے چھت کو گھور رہی ہے، اب اُس کونے سے کوئی آواز
نہیں آرہی ہے کوئی چٹ پٹی بحث نہیں ہو رہی۔ کوئی حسن اور حسی مسائل پر گفتگو
نہیں ہو رہی۔ کوئی قومی اور بین الاقوامی سیاست پر تبصرہ نہیں ہو رہا ہے۔ اب تو
بکو کی بھی ہے۔ امر بارش چھاجوں برس رہی ہے اور اندر ریڈیو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ
رہا ہے ـ میرا نام عبدالرحمان ۔ ۔

ادئی امت پھڑ وی میری کلائی۔ کہہ تو دیا کہ میرا نام نورا ہے۔ میرزا الک کرکے
تو تشریف لے کر اپنی کلائی کو سہلا رہا ہے بہت تیرے کی ایسی سیٹ اصل دیکھ گستا

"کوئی کھڑکیاں کھول دو" شانتی دیوی رو رو کر چیخ رہی ہے۔

ہاں کھڑکیاں کھول دو، کتنا حبس ہے۔ امن و انصاف کا ترازو ڈانواں ڈول ہو گیا ہے۔ ایک ان پڑھ جاہل، ایک وحشی غیر تہذیب یافتہ لڑکی نے ایک غیر قانونی فیصلہ دیا ہے۔ ماہر ساگری سانسیں لے رہی ہے۔ کل صبح پھر سورج نکلے گا۔ کل شام کو پھر سورج ڈوب جائے گا۔ اور دور ان پہاڑی سلسلوں کے اس پار ایک پڑھا لکھا، تہذیب یافتہ اور روشن خیال مکھن لال اپنی دوسری بیوی کا گھونگھٹ اٹھائے گا۔ ★★

ڈرگا چیخ رہی ہے۔
وہ جو ایک پرندہ اپنی چونچ سے اپنے ساتھی کے پر سنوار رہا ہے۔
وہ جو ایک مرغی سفید نیم گرم انڈوں پر بیٹھی پیاس کی شدت سے زبان نکال رہی ہے۔
وہ جو ایک کوا پیپل کی پھنگ پر اپنا گھونسلا بنا رہا ہے۔
وہ جو اس گلی پر کھڑی کوئی عورت اپنے ننھے منے بچے کے لئے مامتا میں رو رہی ہے

یہ سب کیا ہے؟
یہ دھاگا جو آنکھوں کے سامنے لٹک رہا ہے، یہ کیوں نہیں کٹتا۔ پتلا سا، مہین سا دھاگا قینچی کے صرف ایک لمس کا منتظر۔
کاٹ دو اس دھاگے کو مرگا، اُسے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ گرا دو اس گیند کو فرش پر تاکہ وہ لڑھکتے لڑھکتے کہیں دور جا گرے۔ ساری کائنات سانس روکے کھڑی ہے ساری رات کھڑکی کے باہر رُک گئی ہے۔ سارا عالم بے حد ہو کر انتظار کر رہا ہے۔
ایسی محرومیوں کو زبان دو!
ایسے لمحوں کو تیزاب بنا کر پھینک دو کسی کے چہرے پر۔ ایسے ارمانوں کو کمان کی طرح ہوا میں اچھال دو۔
"نہیں ——"
"یہ کیسا انصاف ہے؟"
"مجھے یہ انصاف ہرگز نہیں چاہیئے۔ مجھے آگ میں جھونک دو، مجھے سمندر میں پھینک دو، مجھے اندھے کنوئیں میں اتار دو۔ لیکن بھگوان کے لئے مجھ سے اس درخواست پر دستخط نہ کراؤ۔ میں اپنے پتی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتی۔
میں دستخط نہیں کروں گی ——
نہیں کروں گی ——
نہیں کروں گی ——"

ہواؤ! تم سانس کیوں نہیں لیتیں؟
کہیں تم بھی نو سال سے بے ہوش تو نہیں ہو؟
میرے مالک! اِس انتظار کے پر کاٹ دو!
اِس اُمید کی چھاتی کھول دو۔
تاکہ یہ سسکتا ہوا اُچھل کر چُور چُور ہو جائے۔ اب اِس تیشے کی ضرورت نہیں،
کوئی حاجت نہیں ہے۔ اب اِس دھاگے کی کاٹ دو، دھاگے کو، ڈولتے ہوئے تنگ کو ہوا
میں۔ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پھینک دو۔ تاکہ بعد میں کوئی دم گھٹنے کا ذکر نہ کرے۔
کوئی چنگاری کی طرح سُلگنے کی بات نہ کرے، کوئی کھڑکیاں کھولنے کی آرزو نہ کرے۔
"دُرگا! تم بولو، فیصلہ دو۔ آج کسی کی دُنیا تمہاری چھوٹی اُنگلی سے لٹک رہی ہے
ہلاؤ اُنگلی کو، تاکہ ایک کائنات نیچے گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ایک مرکزی سرکار کا ملازم
ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے
گا۔ دنیا جہان میں رُسوا ہو جائے گا۔ صرف اِس درخواست پر دستخط کر دو۔"
"پتا جی آپ کیا کہہ رہے ہیں آج نو سال کے بعد آپ نے کس سوالوں کو
کھنگالا ہے۔"
"ہلاؤ اپنی چھوٹی اُنگلی دُرگا اگر اپنی کسی کی کائنات کو درشن دینے۔ نو سال کی اذیت
کو یاد کرو۔ آج، ابھی، اسی وقت —— یہ لمحہ تمہارا ہے۔ اِس لمحے کو ہاتھوں سے اُٹھا کر
یکڑو، قیمتی ہاتھ میں اور کس کر لو ورنہ یہ اُس پنچھی کے اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ اب وہ کبھی
نہیں آئے گا۔ کر دو دستخط اِس درخواست پر!"
بے رونق آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بہہ رہا ہے۔ بے رنگ پیشانی سے پسینے
کی ایک بوند رِس رہی ہے۔
"آپ نے محبت کے بارے میں کبھی سوچا ہے؟"
"نہیں —!"
"نہیں — نہیں —!!"

پرندو! تم خاموش ہو جاؤ۔
ہواؤ! تم دم روک لو۔
آج ایک مجرم کو خود اپنے مقدمے کا فیصلہ مرتب کر لینے دو!
نو سال کی طویل مدت نسوں میں پھیل رہی ہے اب گھنٹوں میں بدل رہی ہے اب لمحوں میں بکھر رہی ہے۔ اور ایک ایک لمحہ درگا کے دہر پر ایک ایک کنگرا دینے لگا ہے بے رونق آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ بہہ رہا ہے، بے رنگ پیشانی سے پسینے کی ایک ایک بوند ٹپک رہی ہے بے ترتیب بالوں کی لڑیاں ایک ایک کر کے کانپ رہی ہیں۔ اس کے دھاگے کو کوئی طاقت کھینچ رہی ہے اس کا ایک ایک انچ ہاتھوں سے سرک رہا ہے۔

میرے مالک! یہ کیسا عذاب ہے؟

"آپ کتنی خوبصورت ہیں!"

شہد کا ایک قطرہ کانوں میں رس رہا ہے۔

"اس تیج کا منہ نوچنے کو جی چاہتا ہے" لیکن یہ مدھوسودن کی آواز نہیں ہو سکتی۔ اس کی آنکھوں سے تو درگا کو وداع کرتے وقت آنسو بہہ نکلے تھے۔

"چنڈال کے مکے مارنے کو جی چاہتا ہے"

"بس، آہستہ بولو ماں، شہد کو ٹپکنے دو!"

"کیسے آہستہ بولوں بیٹی! تمہارا پتی تمہیں ٹھکرا کر دوسرا بیاہ رچا رہا ہے آہستہ کیسے بولوں۔ یہ جو سنگی چھاتی پر انگارہ دہک رہا ہے۔ تو کیا کراہوں بھی نہیں؟"

"آپ نے شادی کے موضوع پر کون سی کتاب پڑھی ہے؟"

"یہ کس سے کہہ رہے ہو پریتم؟ مجھ سے یا آنے والی دوسری پتنی سے؟" میں آپ کو ضرور اس سوال کا جواب دیتی لیکن آپ نے ایک ہی رات میں ایسی رائے قائم کی اور چلے گئے۔ اس وقت نہ جانے یہ رائے کہاں تھی جب آپ بارات لے کر میری دہلیز تک آئے تھے مگر نو سال کی خاموشی کو زبان کون دے سکتا ہے۔

پرندو! تم بھی نہیں چہچہاتے۔

پڑھ سکتی ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ کوئی انگریزی اخبار بھی نہیں پڑھ سکتی اس لئے اِس اَن پڑھ
جاہل، بیک ورڈ، غیر تہذیب یافتہ درگا کے ساتھ مکھن لال ایم اے یو ڈی سی کا ساتھ کیسے
ہو سکتا ہے؟ آپ ہی بتائیے؟ مکھن لال کہتا ہے کہ اُس کا بس چلے تو وہ اُسے انگریزی رائفل
سے شوٹ کر دے۔ آپ کی بلا سے شوٹ کر دے۔ لیکن دُرگا شوٹ کرنے کی دھارسی نہیں جاتی
ہے۔ وہ تو بس اُس تعویذ کو جانتی ہے جسے گلے میں لٹکاتے وہ پچھلے نو برس سے مکھن لال کا انتظار
کر رہی ہے۔ اُس نے اُس کے ایک تنکے سے دھاگے کا سرا پکڑ لیا ہے اور اُسے یقین ہے کہ یہ دھاگا
کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ (جاہل لڑکی!) اب یہ الگ بات ہے کہ درگا اِس دھاگے
کو پکڑے پکڑے خود دھاگا سی بن گئی ہے۔ اور ایک ہوا کے جھونکے کی منتظر ہے کہ جس سے یہ دھاگا
ٹوٹ کر تار تار ہو جائے۔ (ایک انقلاب آ جائے) درگا اگر ایسا ہی کر رہی ہے تو اِس میں
کسی مرد یا کسی عورت کو دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دُرگا نہ تو مرد ہے اور نہ عورت
ہی۔ وہ تو صرف ایک اِستری ہے جسے اُس کے پتی نے قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے یعنی سورج غروب ہونے کے وقت اُس کچی پکی اینٹوں کے
بنے ہوئے مکان کی کھڑکی بند ہو گئی ہے، اُس کھڑکی کے پیچھے اگر کوئی بے چین ہے کوئی پہلو بدل
رہا ہے کوئی پارے کی طرح تڑپ رہا ہے کوئی چنگاری کی طرح سُلگ رہا ہے تو آپ
بالکل خیال نہ کیجئے۔ کیونکہ اُس کھڑکی کے پیچھے بات ہی ایسی ہو گئی ہے۔ وہاں ملزم سے
یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اُلجھے ہوئے مقدمے کا فیصلہ خود کرے۔

یہ کیسا فیصلہ ہے؟
یہ کیسا انصاف ہے؟
یہ کیسی عدالت ہے؟

سب سانس روکے منتظر ہیں پنڈت مدھو سودن بھی، جانکی دیوی بھی، دُرگا کا
ماموں بھی، درگا کا بھائی بھی کوئی پتہ نہیں ہل رہا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی سب منتظر ہیں
در و دیوار تک!

دُور کوئی پرندہ خواب میں بڑبڑائے گا تو درگا کو کسی بات کے بھنور میں ڈال دیگا

یہ الگ بات ہے کہ لڑکی دو روپے والی جیبی کی گڑیا تو ہے نہیں کہ آدمی نے اٹھا کر جیب میں
رکھا اور چلتا بنا۔ لیکن یہ بات سمجھنے کی ہے نہ سمجھانے کی۔ اور آپ دھو سودن کہتا ہے یہ شادی
نہ ہوئی ہوتی تو زندگی یوں اجیرن نہ ہوتی۔

ایک دھو سودن کی زندگی اجیرن ہے۔ ایک جانکی دیوی کی زندگی ویران ویران ہے
ایک درگا کا جیون برباد ہے۔ تو آپ کیوں اپنی نیند اچاٹ کریں گے؟ آپ سو جائیے کیونکہ
درگا کا پتی مکھن لال بھی ایسے ہی دہلی کے اس کوارٹر میں سو گیا ہے جو اسے سرکار کی طرف سے
رہنے کو ملا ہے۔ یہ کوارٹر ہر ایل ڈی سی کو ملتا ہے ہر کلاس فور آفیسر یعنی چپراسی کو ملتا ہے۔
ای ای باری بہر مرکزی سرکار کے ملازم کو ملتا ہے۔ اور اس کا کرایہ اس کی تنخواہ سے کٹتا
رہتا ہے۔ اس لئے آپ کو اس بات سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے مکھن لال سرکاری کوارٹر میں
سو گیا ہے، اسے سونے دیجئے۔ اسے نیند کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ ایک یو ڈی سی
ہے یعنی اوپر کے درجے کا کلرک ہے۔ اور کلرک کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ جب پیدا ہوا
تو گھر والے اللہ میاں کا شکر ادا کیا کہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک پڑھا لکھا اتنی وجود
میں آگیا۔ اس لئے اسے سونے دیجئے کہ دن بھر کا تھکا ماندہ ہے۔ یہ تھکاوٹ صرف جسمانی ہے۔
ورنہ اس کا دماغ اور شعور تو پہلے ہی ابدی نیند سو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکھن لال کو درگا
کی یاد کبھی نہیں آتی۔ لیکن آپ کو مکھن لال کی ذات سے تو کیا اس بات سے بھی دلچسپی نہیں ہو سکتی
کہ مکھن لال نے شادی کے دوسرے ہی دن اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ کیسے نہ چھوڑتا؟ طلاق
تو دے نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے اس کے پاس کوئی مذہبی یا قانونی وجہ نہیں تھی۔ اور
اس کے ساتھ نباہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ درگا خوبصورت نہیں تھی۔ اس لئے
بھی نہیں کہ وہ سگھڑ نہیں تھی۔ اس لئے بھی نہیں کہ اسے اپنی بیوی سے محبت نہیں تھی بلکہ اس
لئے کہ وہ خود جیسے ایم اے پاس ہے۔ اور درگا نے کوئی پاس فیل کا چکر قبول نہیں کیا تھا
آپ ہی سوچئے کہ اس صورت میں نباہ کیسے ہو سکتا ہے۔ درگا اس کے انگریزی لٹریچر بھی
نہیں پڑھ سکتی وہ اس کے ساتھ انگریزی میں باتیں بھی نہیں کر سکتی اور وہ اس کے کندھے
کے ساتھ لگی لگی شام کو کناٹ پلیس میں تفریح بھی نہیں کر سکتی اور نہ کسی انگریزی فلم کو دیکھ کر

ہیں جو دُرگا کے دماغ پر کبھی منڈلاتے ہیں اور کبھی نہیں منڈلاتے کبھی ایک لمبوترا چہرہ سامنے آتا ہے ستواں ناک والا۔ متوالی آنکھوں والا۔ جوانی کے حسن سے تمتماتا ہوا چہرہ۔ اور کبھی نہیں آتا۔ وہ قمیص کے کھلے کالر سے جھانکتا ہوا سینہ، کبھی یاد آتا ہے، کبھی نہیں آتا۔ وہ ان جانی ان بوجھی آواز کبھی کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور کبھی کان اُس آواز کے لئے ترستے ہیں۔ ترستے ہیں۔

"آپ کتنی خوبصورت ہیں۔"

"کیا آپ کو میں پسند آیا؟"

"آپ نے محبت کے بارے میں کبھی سوچا ہے؟"

"آپ نے شادی کے بارے میں کون سی کتاب پڑھی ہے؟"

"تو آپ انگریزی بالکل ہی نہیں جانتیں۔ کیوں بھلا؟"

آج نو سال کے بعد یہ باتیں کوئی اثر نہیں رکھتیں لیکن اُس رات یہ باتیں کانوں کو بھلی لگی تھیں اسے یقین ہی نہیں آتا۔ کبھی رات کی تنہائی میں، کبھی ان دیکھے کمرے میں، کسی انجانے آدمی نے یہ باتیں کہی تھیں۔ مگر باتوں کا کیا ہے، ہر کوئی باتیں کر سکتا ہے باتیں کرتا ہے کسی ہیڈی لامر کے ہونٹوں سے ادا کیا ہوا ڈائیلاگ تو ہے نہیں۔ کسی مہاتما گاندھی کے منہ سے نکلا ہوا بول بھی نہیں ہے۔ اور نہ کسی ابراہیم لنکن کی کوئی تقریر ہے جو آدمی یاد رکھے اور دوستوں کی محفل میں دہراتا پھرے۔ اب اگر دُرگا ان باتوں کا تعویذ بنا کر اپنے گلے میں لٹکاتی پھرے تو اس میں آپ کیوں دلچسپی لینے لگے۔ دراصل ان باتوں میں پنڈت مدھوسودن کو بھی دلچسپی نہیں ہے۔ اُسے تو صرف اس بات میں دلچسپی تھی کہ کسی طرح دُرگا کی شادی ہو جائے۔ اُس نے دُرگا کی شادی کی تھی، اس لئے نہیں کہ دُرگا اُس کے سینے پر بوجھ بن کر بیٹھی تھی۔ اِس لئے بھی نہیں کہ دُرگا کوئی عمر میں بہت بڑی تھی۔ وہ تو شادی کے وقت صرف سولہ برس کی تھی وہ دُرگا کی شادی میں اِس لئے دلچسپی لینے لگا تھا کہ دُرگا سب کچھ ہوتے ہوئے ایک لڑکی بھی تھی۔ اور اُس کی دانست میں لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا جانے کب کوئی متوالا جادوگر آئے اور لڑکی کسی جادو بھری اتر سے اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے اس

کرنے میں جانے لگے ہیں۔ اپنی محور سے ٹل اسی جگہ ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر لوٹنے لگے ہیں۔ ایسے
دوست سے ہاتھ ملا کر بائی بائی کی صدا لگانے کے بجائے راستے پر ہو لیے ہیں۔ اور اس کچی پکی
اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کی مغربی کھڑکی سے یہ چہرہ بھی کھڑکی بند کرنے کے بعد غائب ہو گیا ہے
لیکن فرق ضرور ہے۔ ایک معمولی سا فرق۔ آپ نے پہاڑوں کی گلنار چوٹیاں دیکھیں اور ڈوبتے ہوئے
سورج بادلوں کی لال لال چھتری دیکھی اور خوش ہوتے۔ آپ نے رنگوں کا طلسم دیکھا اور مسکرا
دیے۔ لیکن اس چہرے نے ایک چتا دیکھی اور رو دیا۔ آگ کی لپٹوں کی بانہیں دیکھیں اور دنیا
بس اتنا ہی فرق ہے اور اس کے لئے آپ کو اپنی راتوں کی نیند حرام کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ
اس کے لئے درگا، اور اس کی ماں اور اس کا باپ ہی کافی ہے۔ درگا، جی ہاں، اس چہرے کا بھی
نام ہے۔ آپ مزے اور شوق سے اپنے ڈن لپلو کے میٹرس پر آرام کیجئے۔ اپنے مخملیں بستر پر سو جائیے۔
درگا شاید نہ سو سکے گی۔ کیونکہ اُسے پچھلے نو سال سے شب بیداری کی بیماری لگ گئی ہے۔ اور یہ سزا
اُسے ایک بہت بڑے جرم کی پاداش میں دی گئی ہے۔ آپ نے بھی ممکن ہے ایسا جرم کیا ہو یا کرنے
والے ہوں۔ مگر آپ کی بات اور ہے۔ اس جرم کا نام شادی ہے۔ اگر لوگوں سے بھرے ہوئے
کمرے میں اگنی کے گرد پھیرے کرنے کا نام شادی ہے۔ اگر کانپتے لرزتے ہاتھوں سے کسی کے گلے میں مالا
ڈالنے کا نام شادی ہے۔ اگر لمبا سا گھونگھٹ نکال کے کسی انجانے، ان دیکھے مرد کے گھر ڈولی میں کر
جانے کا نام شادی ہے تو درگا نے پورے نو سال پہلے ضرور شادی کی ہے۔ درگا کا باپ پنڈت
مدھو سودن اور درگا کی ماں جانکی دیوی بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے اپنی لڑکی کے
ہاتھ پیلے کئے ہیں۔ اور اسی غلط فہمی نے درگا کو وہ سزا دی ہے جو وہ نو سال سے بھگت رہی ہے
درگا کو اب یاد بھی نہیں ہے کہ وہ آخری بار کب ساری رات بے فکری کی اور بھرپور نیند
سوئی تھی۔ شاید شادی سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ شادی
کی رات وہ نہیں سو سکی تھی ..... دن بھر سر پہ بوجھ لادے بیٹھنے کی وجہ سے اور ایک انجانے اور
ان دیکھے جادوگر کی وجہ سے جانے وہ جادوگر کیسا تھا، اب تو اس کی صورت بھی کسی
دھندلے نقش کی طرح دماغ کی سلیٹ سے مٹ گئی ہے۔ اس رات کی وارداتیں کیسی ہیں؟
جو کبھی کھل کے سامنے آ جاتی ہیں اور کبھی بالکل ہی دکھائی نہیں دیتیں۔ چند غیر مرئی سائے سے

کسی کورو کشیتر کی جنگ کی یاد آئے گی۔ اور آپ کا رومانٹک موڈ خراب ہو جائے گا اس
لئے آپ اس چہرے کو بالکل نظر انداز کیجئے۔ آخر اس کچی پکی اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کی کھڑکی
سے جھانکتا ہوا چہرہ ہی تو ہے کسی اجنبی فرد بشر کا چہرہ تو ہے نہیں۔ جو آپ اپنا موڈ خراب کریں گے۔
اور پھر ایک بات اور بھی ہے، یہ چہرہ سدا سے ایسا ہی تو تھا نہیں، اگر ہوتا تو کوئی نہ کوئی
ضرور اسے شیشے کے بکس میں بند کر کے عجائب گھر میں، رکھتا اور ساتھ ہی ایک چھوٹی سی تختی
چسپاں کر دیتا جس پر سنہری حروف میں لکھا جاتا: "دس ہزار سالہ پرانی مصری ایک ممی"
تب اگر آپ اس چہرے کو دیکھتے تو کم از کم آپ کے پاس ایک تاریخی جواز تو ہوتا۔ مگر ایسی
بات نہیں ہے۔ یہ چہرہ سدا سے ایسا نہیں تھا آپ جو یہ زرد رنگ دیکھتے ہیں کبھی یہ گلاب کی
طرح کھلا کھلا تھا، جسے دیکھ کر کشمیری سیبوں کی یاد آتی۔ یہ آنکھیں بے رونق نہ تھیں ان میں
ایک شرمیلی سی اُجلی اُجلی چمک تھی۔ یہ ہونٹ مرجھائے ہوئے بے جان نہیں تھے۔ بھرے بھرے
اور لال لال تھے۔ اور یہ گمان ہوتا تھا کہ ذرا سا چھونے پر ان میں سے رس کی ایک بوند نکل
آئے گی۔ یہ بال بے ترتیب اور اُلجھے اُلجھے نہیں تھے۔ ساون کی گھٹاؤں کی طرح سارے ماحول
پر چھائے رہتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ ان کے سائے میں گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر سستا لیا
جائے۔ اُن دنوں اِس مکان کی کھڑکی میں یہ چہرہ دیکھ کر آپ شفق کا منظر دیکھنا بھول جاتے
اور بالکنی میں آپ کے ہاتھ سے آپ کی رفیقۂ حیات کا ہاتھ خود بخود چھوٹ جاتا آپ کے
کندھے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی یہ آپ کی محبوبہ کھسک جاتی۔ آپ کا ہاتھ ہر دیارک
میں آپ کے دوست کے شانے سے پھسل جاتا۔ مگر یہ گزرے ہوئے دنوں کی بات ہے اور
صرف تاریخ لکھنے والوں کے کام کی چیز رہ گئی ہے۔ اب، ابھی، اِس وقت یہ چہرہ رحم طلب
کرتا ہے۔ اِس لئے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیجئے۔ شوق سے شفق کا لطف اٹھا
لیجئے۔

لیجئے باتوں باتوں میں سورج غروب ہو گیا ہے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں
میں دبک گئے ہیں۔ کبوتروں کا ایک جوڑا بے ہنگم صدائیں بلند کر کے صنوبر کے درخت
کی پھننگ پر گٹرگوں کر رہا ہے۔ آپ بھی اپنی رفیقۂ حیات کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اندر

جھیل کے اُس پار سورج ڈوب رہا ہے اور پہاڑی چوٹیوں کی پیشانیاں تمتمانے لگی ہیں۔ بادلوں کے آنچل خون میں ڈوب گئے ہیں اور پرندوں کی ٹکڑیاں بس کر دل ڈوبنے لگے ہیں۔ ہائے سورج ڈوبتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ جھیل کے اِس پار اُس کچی پکی اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کی مغربی کھڑکی کھلی ہے۔ اور ایک زرد چہرہ کھڑکی سے جھانکنے لگا ہے۔ آپ اِس چہرے کی بے رنگی پر نہ جائیے حضور! آپ اِن آنکھوں کی بے رونقی کو نہ دیکھئے آپ ان بالوں کی بے ترتیبی کا خیال نہ کیجئے۔ آپ ان ہونٹوں کی کپکپاہٹ پر بھی دھیان نہ دیجئے۔ کیونکہ اس طرح آپ کو یہ چہرہ رحم طلب نظر آئے گا۔ اور اس وقت جب کہ آپ بالکل ہی رومانٹک موڈ میں شفق کا نظارا کر رہے ہیں جب کہ آپ اپنی بالکونی میں کھڑے اپنی رفیقۂ حیات کے ہاتھ میں ہاتھ دیے رنگوں کے طلسم میں کھو گئے ہیں۔ جبکہ آپ جنت جانو پل پر اپنی محبوبہ کے کندھے سے لگے لگے آسمان کی سرخیوں میں گم ہیں جبکہ آپ سرِ پارک میں بیٹھے اپنے دوست کے شانے پر ہاتھ رکھے بادلوں کے آنچل کی سرخ کناری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں تو اس چہرے کی طرف دیکھ کر آپ کو کسی طوفانِ نوح کا خیال آئے گا۔

اچانک اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ برآمد ہوئی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔۔۔ اور دوسرے لمحے اُس کی گردن لٹک گئی۔

نورتن نے بگھی موڑنے کا اشارہ کیا۔

وسیع و عریض دالان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نورتن نے پیش کار کو سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کرنے کے احکام جاری کئے۔۔۔ ساتھ ہی اشارہ کیا۔۔۔ اشارہ ملتے ہی سازندے اپنے اپنے ساز لے کر آ گئے۔ پھر موتیوں کی جھالر والا پردہ سرک گیا اور رقاصہ تھرکتی ہوئی نمودار ہو گئی۔۔۔ اور رات بھر کے لیے محفلِ رقص و سرود کا آغاز ہو گیا۔

دوسرے دن شہر کے لوگ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے کہ ٹماٹر ڈیڑھ روپیہ کلوگرام مہنگا بک رہا ہے۔ ڈیزل ایک سو دس روپیہ کوئنٹل مہنگا ہو گیا ہے۔ ٹرین کا کرایہ بڑھ گیا ہے۔ ڈی ٹی سی بس کے روٹ پر گزرنے والوں سے زبردستی دس پیسہ روپے کے حساب سے تاوان لیا جا رہا ہے۔ ٹم ٹم پر سفر کرنے والوں سے دوگنا کرایہ وصول کیا جا رہا ہے۔ اور لٹکے ہوئے گوشت کے ٹکڑے دوگنے بھاؤ پر بک رہے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ بچوں کے ٹرائیسکلوں کا بھاؤ اڑھائی گنا زیادہ بڑھ گیا ہے

مگر کافی سوچ بچار کے باوجود یہ کوئی نہیں جان سکا کہ صرف اُن اشیاء کے دام کیوں بڑھ گئے ہیں، جو صرف "ٹ" سے شروع ہوتی ہیں۔ اب یہ راز نورتن کے ساتھ ہی تاریخ کا ایک واقعہ بن کر آنے والی صدیوں کا منہ چڑھاتا رہے گا ★★

امداداً کوئی دس فیصدی تھے۔ بیتس کا رے ڈرتے جھجکتے اپنا اندازہ بتایا۔
اس صورت میں ایک تباہی فرماں رقم طراز کیا جاتے کہ ہر بچے پر لازم ہے کہ
ٹرانسسٹل چلائے۔ اور ہر والدین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر وہ ایسے بچے کو ٹرانسسٹل
روکتے نہیں رہتا تو اُسے سالانہ دس روپے فی بچہ کے حساب سے تباہی خزانے میں لطور
ڈالہ جمع کرانا ہوگا۔ بیتس کا رے لکھتے لکھتے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ یوں کی
ملازکے بیتس لطراً سے ہر سال اتنی روپے تباہی خزانے میں جمع کرائے ہوں گے وہ
زیادہ ہی پریشان ہوگیا۔ اپنی فہرست میں ٹرانسسٹل بھی درج کردو۔ لورتس اریلب
ملازما تھا۔
مگر۔ مگر دولت پناہ اپ یہ فہرست کس عرض سے تیار کی جارہی ہے۔
لورتس نے ایک قہقہہ بلند فرمایا۔
ہمیں معلوم تھا تم یہ ضرور پوچھوگے۔ تاہم تھوڑا سا صبر اور کرلو۔ فہرست ابھی
نامکمل ہے۔
اچانک لورتس نے ایک جگہ گھنی ر سے کا اشارہ کیا۔ سامنے دکان میں لوگوں
کی بھیڑ لگی تھی۔
یہ لوگ یہاں کیا خرید رہے ہیں، اُس نے بیتس کار سے پوچھا۔
تکّے عالم پناہ اکو تلوں پر سیکے ہوئے گوشت کے تکّے۔ سامنے اس دکان کے تکّے
کافی دور دور تک مشہور ہیں۔
تکّے؟ اپنی فہرست میں اندراج کردو بیتس کار۔
ایک بار پھر بیتس کار کشمکش وتیج میں پڑ گیا۔ کہ یہ کیا ہوا کیا ہے۔ ایک بار پھر اس کے
ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔
لورتس نے اس کی یہ حالت بھانپ لی۔ اُس نے قہقہہ بلند کیا۔ اور پھر نہایت
رازدارانہ انداز میں بیتس کار کے کان میں یہ راز افشا کردیا۔
بیتس کار نے دل ہی دل میں جمع تفریق کیا۔ پھر اُنگلیوں پر کچھ گننے لگا۔ اور پھر

موقلم اور کاغذ پیش کیا گیا۔ پیش کار نے قلم سنبھالی اور لورنس کی طرف اُمید بھری
کی نظروں سے دیکھا۔

ٹماٹر۔ لورنس کے مُنہ سے یہ لفظ اُچھل پڑا۔ پیش کار نے قلم بند کیا۔۔۔۔
ٹریں۔ ٹیں۔ ٹم ٹم۔ ٹرک۔ ٹیلی گرام۔ ٹیلی فون۔ ٹیلی ویژن۔ ٹاٹ۔ ٹوپی۔ ٹی کوزی۔
لورنس کے منہ سے الفاظ کی بارش ہوتی رہی۔ پیش کار قلمبند کرتا رہا لکھتے لکھتے
پیش کار سوچتا رہا کہ بائیس سالہ ملازمت کے دوران اُس نے منوں کاغذ سیاہ کئے
ہوں گے۔ بے شمار حکم نامے اور فرمان تحریر کئے ہوں گے۔ مگر ایسی عبارت جیسی وہ
اس وقت تحریر کر رہا تھا۔ اُس نے کبھی قلم بند نہیں کی تھی۔ سوچتے سوچتے پیش کار
پریشان ہونے لگا۔ آخر ان بے ربط الفاظ کی کیا اہمیت تھی کیسے۔ کہیں لورنس
کا دماغ تو اُن، خدا نہ کرے، درہم برہم تو نہیں ہو گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی
پیش کار کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ لکھتے
لکھتے کانپنے لگا۔

ہم جانتے ہیں تمہاری حالت غیر ہوتی جا رہی ہے پیش کار۔ مگر تمہاری حیرت
دُور ہو جائے گی۔ لورنس نے کہا اور پاس کھڑے چوبدار کو صدر دروازے پر بگھی
لانے کا حکم دیا۔

چند لمحوں کے بعد جب پیش کار لورنس کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر مختلف بازاروں
میں سے گزر رہا تھا، تو اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں بدستور موجود تھیں۔ اس کا ہاتھ
بدستور کانپ رہا تھا۔ دفعتًا لورنس اُس سے مخاطب ہوا۔ ہماری مملکت میں سالانہ
کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں پیش کار۔؟

دو لاکھ تیئس ہزار نو سو تیرہ دولت مآب۔

کتنے بچے ٹرائی سیکل چلاتے ہیں؟

یہ اعداد و شمار ہمارے شعبۂ STATISTICS نے مرتب نہیں کئے ہیں عالم پناہ۔

ہمیں معلوم ہے۔ ہم تمہارا اندازہ جاننا چاہتے ہیں۔

ہیں۔

گو تمہارے دولت مآب، غلام نہیں سمجھا۔

ہاں۔ تم واقعی نہیں سمجھو گے۔ یہ مختلف محکموں کے ڈیمانڈس ہیں۔ یعنی اخراجات کی پیشگوئیاں۔

اخراجات کی پیش گوئیاں؟ میں — میں پھر نہیں سمجھا دولت پناہ۔

بے شک تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔ یہ مملکت کے اخراجات کی بات تم جیسے معمولی لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ بہرحال ان اخراجات کے لئے ہمیں آمدنی کے ذرائع تلاش کرنا ہوں گے۔ آج ہماری پریشانی کا سبب یہی ہے۔ جہاں پناہ کو پرورش پیش کرنی ہے۔

پیش کار کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ اس کی انیس سالہ ملازمت کے دوران کئی مرحلے پیش آئے تھے، جب نورتن کو قدرے پریشانی ہوئی تھی۔ مگر پیش کار نے جان کی بازی لگا کر ان مرحلوں کو طے کرنے میں نورتن کی مدد کی تھی — مگر یہ مرحلہ کہ اخراجات کے لئے آمدنی کے ذرائع تلاش کرنے کا مسئلہ تو کبھی پیش نہیں آیا تھا آتا گیا کبھی۔ اس سے پہلے وہ دیگر شعبوں میں پیش کاری کر چکا تھا۔ جہاں اخراجات سے واسطہ تھا، آمدنی سے نہیں۔ اسی سال اسے ترقی عطا کر کے اس شعبے میں بھیج دیا گیا تھا۔ اور اسی سال یہ پیامرحلہ درپیش ہوا تھا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے نورتن کی طرف دیکھا۔ نورتن کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم کا سایہ تیر رہا تھا۔

پیش کار کو لگا جیسے اس کی شہ رگ پر سے کسی نے خنجر اٹھا لیا ہو۔

ہمیں معلوم ہے تمہارے لئے یہ مسئلہ نیا ہے۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ تم اس کوزے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرچی نکال دو۔ اس میں "اٹھے لے گزی سنگ پرچیاں ہیں۔

پیش کار نے ڈرتے جھجکتے کوزے میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک پرچی باہر نکالی۔ پرچی پر "پرورش" کا حرف لکھا ہوا تھا۔ نورتن نے پرچی دیکھ کر حکم صادر کیا کہ مو قلم اور کاغذ پیش کیا جائے۔

سے کے زیر و بم کی بے قراری کو دیکھا۔ اس کی تیلی کمر سے مدھی ہوئی اُس طرار کمر کو دیکھا، جس کے ہر حلقے سے ایک ایک تار دل کی تلک رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے لوری کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ سارندے محو انتظار تھے کہ کوئی مبہم سا اشارہ ملتے ہی وہ فضا میں موسیقی کا سحر بکھیر دیں۔ جلیس کے پیچھے ماندیاں صف باندھے کھڑی تھیں کہ اشارہ ملتے ہی، وہ چاروں طرف ناب کی برسات برسائیں۔ ہوا سانس روکے کھڑی تھی۔ کہ اس تنے ہوئے ماحول میں سانس لینا گناہ تھا۔ پتیسکار کو محسوس ہوا کہ وقت کا ہر گزرتا ہوا لمحہ اس کے وجود کو موم بتی سے ڈھک رہا ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی۔ کچھ لمحے اور ایسے ہی گزرے تو وہ دیا دماہ ہمیشہ کے لیے بے خبر ہو جائے گا۔

رقاصہ کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ مگر اشارہ نہیں ملا۔

سارندوں کی نگاہیں پتھرا گئیں۔ مگر اشارہ نہیں ملا۔

ماندلوں کے ہاتھ پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ مگر اشارہ نہیں ملا۔

پتیسکار نے دیکھا کہ موت کا فرشتہ قدم بقدم اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر اشارہ نہیں ملا۔۔۔ دفعتاً فضا کا یہ سانچہ ٹوٹ گیا۔ ایک آواز فضا میں گونج اٹھی۔

تحلیہ!۔۔۔

جیسے ہوا پھر سے چلنے لگی۔ رقاصہ نے ماتھوں کی محراب سمیٹ لی اور تیز تیز قدموں سے دالان سے چلی گئی۔ سارندوں نے اپنے ساز سنبھالے اور دبے پاؤں باہر چلے گئے۔ ماندیاں قطار باندھے اگلے دالان میں چلی گئیں۔۔۔ پتیسکار نے دیکھا اب اس وسیع و عریض دالان میں صرف وہ تھا۔۔۔ اور سامنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے لوری۔۔۔

یہ کا عدالت دیکھ رہے ہو پتیسکار؟

دیکھ رہا ہوں دولت آپ۔۔۔

جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ہمارے محاسنوں کے مرتب کیے ہوئے گوتوارے

نیتکا نے دیکھا کہ حقّے کی چلم جو ہاتھی پور چاندی کی بنی ہوئی تھی، اور
جو نقش و نگار سے آراستہ تھی، اور کسی ماہر کاریگر ملکہ دستکار کی مہینوں کی عرق ریزی
کا ماحصل تھی۔ اور جس سے خوشبودار تمباکو کا نیلا دھواں ایک مجموعہ جال سے
اُٹھ رہا تھا۔ نورتن کا موڈ درست کرنے میں آج خلافِ معمول کوئی رول ادا نہیں
کر رہی ہے۔ اُس کا ماتھا ٹھنکا کیونکہ نیتکا جانتا تھا کہ نورتن کے نامناسب موڈ کا
رول بیشتر اُسی پر گرتا ہے۔

چنانچہ اُس نے پاس کھڑے ایک خدمتگار کو اشارے سے بُلایا اور کان میں کچھ
کہہ دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے موتیوں کے جھالر والا ایک پردہ سرک گیا اور ریشم جالی ہوئی
ایک رقاصہ نمودار ہوئی۔ رقاصہ آکر رقص کے ایک مخصوص انداز میں کھڑی ہوگئی۔
نورتن نے رقاصہ کی طرف دیکھا اُس کی بانہوں کی محراب کو دیکھا۔ اس کے تہہ در تہہ پھیلے
ہوئے ریشمی بالوں کی طرف دیکھا۔ اُس کے ابروؤں کی کھنچی ہوئی کمانوں کو دیکھا اس کے

پہنچا — صبح کی ملگجی روشنی میں کئی آدمیوں کے سائے نظر آئے — میں آدمیوں کی بھیڑ کو چیر کے چمپا کلی کے جھونپڑے میں گھس گیا — سامنے چمپا کلی بانس کی تیلیوں کی دیوار کے ساتھ بیٹھی تھی — اور ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

• چمپا کلی — میں نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔

• آؤ کھڑے بالو، آج دیا میرا تماشہ دیکھنے آگئی ہے۔ اس کی آواز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔

• کیا ہوا — کوئی لوٹا کیوں نہیں۔

• میری بچی اس ڈرائی کلینر کے لونڈے کے ساتھ بھاگ گئی ہے کھڑے بالو۔

میرے کانوں میں چمپا کلی کی آواز کا ٹھہراؤ پھر کھنکنے لگا اور اچانک میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا — ایک — ایک لوکدار خنجر میرے جگر میں اتر گیا — دھیرے دھیرے۔ رک رک کر — ایک میٹھی میٹھی سی چبھن محسوس ہونے لگی — اور پھر میرے دل کے اندر وہ سیپ ٹوٹ گیا اور ایک اچھوتا، انمول، ان دیکھا موتی باہر اچھل کر گرد و غبار کی تہوں میں چھپ گیا۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے — شاید آپ مجھے سنگسار بھی کریں گے — شاید آپ میرے جسم کو پاؤں تلے کچل ڈالیں گے — شاید آپ میری بوٹی بوٹی کر کے گلی کوچوں میں پھینک دیں گے — مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے چمپا کلی کی آنکھوں میں املیاں کی جھلک دیکھی جیسے سالہا سال کا بوجھ اس کے کندھے سے اتر گیا ہو

• • •

کر ایک چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
میں نے سامنے والے مکان کی طرف دیکھا۔ وہ کھلی کالف کسی نے کھاد ماہے بستری لڑکی کے پاس کھڑا آس پاس کا جائزہ لے رہا ہے۔ اوہ یہ تو صبح ہونے لگی ہے۔ ایک اور رات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ مجھے تو اب ہر رات سے ڈر لگنے لگا ہے۔ دن کو کام ختم ہوتے ہی حوراب اپنی سوغات لے کر سر پر سوار ہو جاتی ہے۔
میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ انگ انگ میں جیسے کسی نے ایبوں کے ٹیکے لگا دیئے ہیں۔ پلکوں پر جیسے کسی نے دہکتے انگارے رکھ دیئے ہیں۔ میں سوچا جاتا ہوں۔ سوچا جاتا ہوں۔ سوچا جاتا ہوں۔ ٹھہریئے ایسلے دروازہ تو بند کر دوں۔ اکثر لوگ حواب چرانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور مجھے ایسے حواب بہت پیارے ہیں۔ بہت خوبصورت حواب دیکھتا ہوں میں۔ ڈھلی ڈھلائی سلک لگی ہوتی لیس کی طرح۔ پیلے پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی بطخوں کی قطار کی طرح۔ بیٹھے ہمر کر کھانے کے املیاں کی طرح۔ پہاڑی ڈھلوان پر گونجتی ہوتی بانسری کی گونج کی طرح خدا کے لئے میرے حواب مت چراؤ۔ میرا جسم اور میری روح اور میری جیسائی اور میری حس اور میری مردانگی تو تم پہلے ہی لوٹ کر گئے ہو۔ خدا کے لئے میری طرف مت بڑھو۔ کہیں ایسا ہو کہ میری بے بسی تمہیں روک نہ سکے اور۔
• کھڑکے بابو۔ اے کھڑکے بابو۔
کوئی دروازہ زور زور سے پیٹ رہا ہے۔ ایک ٹک سونے بھی نہیں دیتے۔
• کھڑکے بابو۔ جلدی آؤ۔ جیا کلی ہے
یک لخت میں نے چادر پرے پھینک دی اور آنکھیں ملتا ہوا لپک کر دروازے تک پہنچ گیا۔
• کیا ہوا جیا کلی کو۔ میں نے خود ہی اپنی آواز کا اجنبی پن محسوس کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہی جیا کلی کے رستہ پر چا

یا ہیں ۔ وقت کی تیرہ دستی نے لوہرتنے کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ جمیاکلی کو میرا چہرہ کہاں نظر آئے گا۔ وقت کی سیاہی نے ہرتنے پر کالک تھوپ دی ہے ۔ زندگی کے کانٹے ہر سال میں چبھ گئے ہیں۔ پرتمام ہی عورتیں سوالیہ نشان بنتانی پر جیکانے گلی کوچوں کے پھیرے کرتی ہیں ۔ دن دہاڑے روشن بیتیا بیوں والے بچے تنا سرا ہوں پر بھیک مانگنے نکل جاتے ہیں ___

منہ اندھیرے ایمان والے لوگ بے ایمانی کا دھندہ کرنے گلیوں میں مارے مارے پھرنے لگتے ہیں۔

بھوک کے بھوت تمام کونوں چھدروں میں گھس آتے ہیں، اور ایمان اور نیکی، شرافت اور انسانیت، عصمت اور حیا کا سودا کر کے چلے جاتے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے میرے معبود! یہ کیسا گرہن لگ گیا ہے۔ کہ لوگوں کے اُجلے تن میلے چیتھڑوں سے بھی محروم ہو گئے ہیں ___ ماداں بڑھیا، سمجھتی ہے میں رو بھی نہیں سکتا۔

"پہلے لوگ آمد کے سہارے جی لیتے تھے کھڑے مالو!

اب کون کیسے جے ؟

اب بھی لوگ جی لیتے ہیں جمیاکلی ___ اپنی بیٹی کا بازار سجا کر۔ اب بھی لوگ جی لیتے ہیں ماداں عورت! اپنے بھائی کے سینے میں برچھی اُتار کر۔

اب بھی لوگ جی لیتے ہیں میری بھولی ماں! اپنے لختِ جگر کو ڈیڑھ کلو چاول کے بدلے بیچ کر۔

اب تم اُٹھ کے چلی جاؤ جمیاکلی! تیری طرف دیکھ کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُٹھ کر تمہارے اِس دُکھی سے محور سے بے چارے چہرے پر جوں کی نے کر دوں۔

"کھڑے مالو! کھڑے مالو!! تمہیں کیا ہو گیا ___ تمہارا چہرہ اتنا بھیانک کیوں ہو گیا ___ یہ تمہاری آنکھوں میں خون کیوں اُتر آیا ہے ___ اے کھڑے مالو" جمیاکلی ہیبت کیفیت میں ہاتھ ملنے لگی ۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف کسی کو تلاش کرنا شروع کیا

ٹو ایک چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے سامنے والے مکان کی طرف دیکھا۔ وہ کھلی کھڑکی کسی نے کھاد مانجے بستری
لڑکی کے پاس کھڑا آس پاس کا جائزہ لے رہا ہے۔ اوہ یہ تو صبح ہونے لگی ہے۔ ایک
دررات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ مجھے تو اب ہر رات سے ڈر لگنے لگا ہے۔ دن کو کام اد ھر
وئے میں خواب اپنی سوغات لے کر سر پر سوار ہو جاتی ہے۔

میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ انگ انگ میں جیسے کسی نے ایوں کے ٹیکے لگا دیئے
ہیں۔ پلکوں پر جیسے کسی نے دہکتے انگارے رکھ دیئے ہیں — میں سونا چاہتا ہوں۔
سونا چاہتا ہوں — سونا چاہتا ہوں۔ ٹھہریئے پہلے دروازہ تو بند کر دوں
آجکل لوگ خواب چرانے کے عادی ہو گئے ہیں — اور مجھے اپنے خواب بہت پیارے
ہیں۔ بہت خوبصورت خواب دیکھتا ہوں میں — دھلی دھلائی کلف لگی ہوئی
لٹس کی طرح — پیلے پانی کی سطح پر تیرتی موتی بطخوں کی قطار کی طرح — بیٹ مہرکر
کھاتے کے املیاں کی طرح — پہاڑی ڈھلوان پر گونجتی ہوئی بانسری کی گونج کی طرح
خدا کے لئے میرے خواب مت چراؤ — میرا جسم اور میری روح اور میری میانی
اور میری حِس اور میری مردانگی تو تم پہلے ہی لوٹ چکے ہو۔ خدا کے لئے میری طرف
مت بڑھو — کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بے بسی تمہیں روک نہ سکے اور —

• کھڑکے بابو! اے کھڑکے بابو

کوئی دروازہ زور زور سے پیٹ رہا ہے — ایک ٹک ہونے بھی
نہیں دیتے۔

• کھڑکے بابو — جلدی آؤ — چمپا کلی —
یک لخت میں نے چادر پرے پھینک دی اور آنکھیں ملتا ہوا لپک کر
دروازے تک پہنچ گیا۔

• کیا ہوا چمپا کلی کو — ؟ میں نے خود ہی اپنی آواز کا اجنبی پن محسوس
کیا اور خواب کا انتظار کئے بغیر ہی چمپا کلی کے وقت — پر جا

یا نہیں۔ وقت کی چیرہ دستی نے تو ہر شے کا چہرہ مسخ کر دیا ہے جمیا کلی کو میرا چہرہ کہاں نظر آئے گا۔ وقت کی سیاہی نے ہر شے پر کالک تھوپ دی ہے۔ زندگی کے کانٹے ہر راہ میں چبھ گئے ہیں۔ پر تمام ہی عورتیں سوالیہ نشان پیشانی پر چپکائے گلی کوچوں کے پھیرے کرتی ہیں۔ دن دہاڑے روشن پیشانیوں والے بچے تھابڑا ہو در در بھیک مانگنے نکل جاتے ہیں ——

منہ اندھیرے ایمان والے لوگ بے ایمانی کا دھندہ کرنے گلیوں میں مارے مارے پھرنے لگتے ہیں۔

بھوک کے عفریت تمام کونوں کھدروں میں گھس آتے ہیں، اور ایمان اور نیکی، شرافت اور انسانیت، عصمت اور حیا کا سودا کر کے چلے جاتے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے میرے معبود! یہ کیسا گرہن لگ گیا ہے۔ کہ لوگوں کے اُجلے تن میلے چیتھڑوں سے بھی محروم ہو گئے ہیں —— نادان بڑھیا سمجھتی ہے میں رو بھی نہیں سکتا۔

"پہلے لوگ اُمید کے سہارے جی لیتے تھے کھڑے مالو!

اب کوئی کیسے جئے؟"

اب بھی لوگ جی لیتے ہیں جمیا کلی —— اپنی بیٹی کا بازار سجا کر۔ اب بھی لوگ جی لیتے ہیں نادان عورت! اپنے بھائی کے سینے میں برچھی اُتار کر۔

اب بھی لوگ جی لیتے ہیں میری بھولی ماں! اپنے لختِ جگر کو ڈیڑھ کلو چاول کے بدلے بیچ کر۔

اب تم اُٹھ کے چلی جاؤ جمیا کلی! تیری طرف دیکھ کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُٹھ کر تمہارے اس دکھی سے محرومی کے مارے چہرے پر خون کی قے کر دوں۔

"کھڑے مالو! کھڑے مالو!! تمہیں کیا ہو گیا۔ تمہارا چہرہ اتنا سیاہ کیوں ہو گیا —— یہ تمہاری آنکھوں میں خون کیوں اُتر آیا ہے —— اے کھڑے مالو" جمیا کلی ہیجانی کیفیت میں ہاتھ ملنے لگی۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف کسی کو تلاش کرنا شروع کیا۔

"ایک پھانک سی دل میں پڑی ہے کھوٹے مالو — ایک انگارہ سا چھاتی پر دہک رہا ہے — ایک حجر سا پہلو میں دھرا ہے۔"

اس لیے کہ تم ایک غریب بڑھا ہو — دن بھر لوگوں کے کپڑے پریس کرتی ہو — اور تمہاری سب سے بڑی کنواری لڑکی کی عمر تیس برس ہے۔

یہ پھانک تو میرے دل میں بھی ہے، کیونکہ میں اپنے بچے کے لئے ایک گرم سیٹ نہیں ہوا سکتا۔

یہ انگارہ تو اُس اسکول ماسٹر کی چھاتی پر بھی دہک رہا ہے، کیونکہ وہ اپنی بیوی کے لئے ایک پیٹی کوٹ نہیں سلوا سکتا۔

یہ حجر تو اُس مزدور کے پہلو میں بھی دھرا ہے، کیونکہ وہ اپنے بچے کے لئے آٹھ آنے کا گڈا نہیں لا سکتا۔

اُف! یہ سامنے کے مکاں میں جلتا ہوا کلی کا ملبہ — اس ملبہ نے تو میرے سینے میں آگ لگا دی ہے۔ ستری صندوق پر بیٹھے بیٹھے اُونگھنے لگا ہے۔ ابھی جب سارے لوگ اپنے اپنے دُکھڑے بیان کرتے کرتے تھک ہار جائیں گے تو میری ابو کی رُوح اپنے کمرے میں آئے گی — ایک ایک چیز کو ٹٹولے گی۔ ایک ایک کونے میں جھانکے گی — وہ میز پر اس کی عینک پڑی ہوتی ہے۔ وہ دروازے کے پاس اس کی چھڑی رکھی ہے۔ وہ کھونٹی پر اس کا کرتہ لٹک رہا ہے — پھر میری ابو کی رُوح ان چیزوں کو چھونا چاہے گی ——— مگر چھو نہ سکے گی۔

آدمی مرنے کے بعد بھی اتنا ہی بے بس ہو جاتا ہے، جتنا مرنے سے پہلے —

"ارے اکھوٹے مالو تم رو رہے ہو؟"

میں ڈبڈبائی آنکھوں سے چمپا کلی کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ بوڑھی کھوسٹ سمجھتی ہے کہ میں رو بھی نہیں سکتا۔

"ہاں چمپا کلی! آج رونا ہی پڑا ہے۔"

چمپا کلی حیرت سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ہے — جانے اُسے کیا نظر آ رہا ہے

لاش کو اُتار دیا۔ پولیس کے ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں۔ دل کی دھڑکن کو ٹٹول ٹٹول کے تلاش کیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ڈاکٹر بابو۔ یہ آدمی تو برسوں پہلے مر گیا تھا" — چمپا کلی پھر رونے لگی ہے۔

"بہت شریف آدمی تھا کھوٹے بابو۔ مجھے کہتا تھا چمپا کلی! تم رتی بھر فکر نہ کرو تیری لڑکیوں کے لیے ور میں خود تلاش کروں گا۔"

اسی لیے تو آتم ہتیا کر لی چمپا کلی — آتم ہتیا نہیں کرتا تو تمہاری لڑکیوں کو اغوا کرتا کیونکہ آج کا اسلام یہی کہتا ہے۔ دنیا خون کی پیاسی ہو گئی ہے ہر آدمی دوسرے آدمی کا خون پیتا ہے۔ اور جو نہیں پی سکتا، وہ آتم ہتیا کر لیتا ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے — اور اگر ہے بھی تو اُسے کسی نہ کسی نیتا نے یا ساہوکار نے یا مکان مالک نے، یا سرکاری افسر نے یا عدالت کے چپراسی نے یا اخبار کے ایڈیٹر نے یا مذہبی پیشوا نے یا سماجی کارکن نے یا خود اپنے ضمیر نے روک رکھا ہے۔

"ہائے اکھوٹے بابو — اب میری لڑکیوں کا کیا ہوگا۔ بڑی مصیبت میں کے بیچ میں آگئی ہے۔"

پگلی! آخر عورت ہی ہے — تو تم بھی بابو کی زندگی کے لیے بس اسی کنواری تیس سالہ لڑکی کے لیے ڈر رہی ہو — ؟ مگر تمہارا کوئی قصور نہیں۔ بھی بابو نے بھی صرف اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچانے کے لیے رسی کا پھندہ تیار کر لیا تھا۔ یہ نہیں سوچا کہ رادھا کا کیا ہوگا اور سشما اور مینتی کا کیا ہوگا — آدمی جیتا بھی اپنے لیے ہے اور مرتا بھی اپنے لیے ہی ہے کوئی رشتہ، کوئی ممتا، کوئی پیار، کوئی ہمدرد، کوئی غم، کوئی خوشی اس دنیا کی چیز ہی نہیں ہے —

اس لیے افیون کی گولی، بھنگ کا دھواں — اور خود فراموشی۔ بھول جاؤ بھول جاؤ کہ تم انسان ہو، زندہ ہو، دیکھتے ہو۔ بھول جاؤ کہ تم باپ ہو، بھائی ہو، دوست ہو۔ بھول جاؤ کہ تم دکھی ہو، خوش ہو، اداس ہو۔

"اس رادھا کا کیا ہوگا کمرشے مالو، شانتا اور قیمتی کا کیا ہوگا؟"

یہ صرف تمہارا سوال نہیں ہے چپاکلی۔ یہ جو محلے کے سارے مرد اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں کھلی ہلائے بیٹھے ہیں۔ یہ سب بھی ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہے ہیں۔ اصل میں یہ سوال ہی موجودہ کرائسس کی بنیاد ہے۔ تم یہ سوال دیکھو تو اچھا ہے مارا شانتا اپنا بھاری بھرکم پریس اور شروع کر دیا مار دھڑا۔

تمہارے اس پریس کی وجہ سے کل لوگ کڑکڑاتی ہوئی قمیضیں اور سرسراتی ہوئی ساڑھیاں پہن کر کام پر جا سکیں گے۔

مگر چپاکلی بدستور رو رہی ہے۔ بے آخر عورت ذات۔ مرد شادی کے دو سال بعد مر گیا ہے۔ تین لڑکیاں اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ کے۔ کیا ابھی شادیاں چھوڑ گیا ہے۔ اور اب تینوں جوان ہو گئی ہیں۔ لوگوں کے کپڑے پریس کرتے کرتے خود بھی ایک پریس بنے ہوئے سرائے کی امید ہو گئی ہے۔ مگر مرد کی چھوڑی ہوئی شادیاں سنبھالنا بھی تو ایک فرض ہے۔ پچیس سال سے چپاکلی اس فرض کو نبھا رہی ہے۔ اور پچیس سال سے ہی انسانی زندگی پھانسی کے تختے پر لٹک رہی ہے

یہ جو چھری تیز دھار تم رگ پر رکھی ہے کسی نے۔ وہ اس کو دباتا کیوں نہیں؟

مگر چپاکلی بدستور رو رہی ہے؟

مار برآمدے میں بلی نے چوہے کو پکڑ لیا ہے۔ اور اب اس کے ساتھ کھیل رہی ہے ۔ چوہا جانتا ہے کہ بلی اسے نگل لے گی۔ مگر وہ اس کھیل سے خوش ہو رہا ہے۔ والے! یہ جو ہر یہی کتنی بڑی مجبوری ہے۔ سب اپنے آپ کو فریب دیے مجبور ہیں۔ اس کھیل میں ایک لطف محسوس کرتے ہیں۔

"آج بیٹی مالو نے آتم ہتیا کیوں کی، کمرشے مالو۔"

آتم ہتیا؟ ارے ہاں! ہم لوگ باتوں کو کتنی جلدی بھول جاتے ہیں۔ میں نے گھر سامنے کے مکان کی طرف دیکھا۔ دو رسی کا ٹکڑا اب بھی چھت سے لٹک رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تیسی مالو کی لاش بھی لٹک رہی تھی۔ مگر بعد میں پولیس کرمچاریوں نے

سامنے درشن پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میں دوبارہ سامنے کے مکان میں کلی کے ملبے کو دیکھ رہا ہوں۔
کمرے میں صندوق پر بیٹھے بیٹھے سنتری نے سگریٹ نکال کر سلگا دیا ہے۔ چند لمحے پہلے کمرے میں بہت چہل پہل تھی۔ پولیس کے کرمچاری، ڈاکٹر، اخباروں کے رپورٹر۔ اب تو صرف سنتری کے سگریٹ کا دھواں ہے۔ اور وہ کلی کا ملبہ۔ ارے! اچھا ہو اس ملبے کو۔ بند کر دو یہ کھڑکی۔ گرد و غبار دہ انسانی زندگی کے چہرے پر راکھ کریدو گے تو چنگاریاں اُڑا اُڑ کر چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ مگر میری بات کون سنے گا۔ کسی کی بات کوئی نہیں سنتا۔

مکان کے پچھلے حصے سے سسکیاں لینے کی آواز آ رہی ہے۔ چند لمحے پہلے تو رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر آوازیں دھیرے دھیرے مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں۔ اور اب صرف سسکیاں لینے کی آواز آ رہی ہے۔
کیوں روتی ہو رادھا؟ تیری تو ساری عمر روتے ہی گزر گئی۔ اب جو یہ لمحہ تیری زندگی میں آیا ہے۔ اس لمحے کے معنی سمجھنے کی کوشش کر۔ مگر میری اس بات کے اندر کھوکھلا پن ہے۔ میری اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت صرف اس کلی کے ملبے کی ہے اور اس سنتری کے سگریٹ کے دھوئیں کی ہے۔ کیونکہ یہی دو چیزیں حقیقی ہیں۔ باقی سب مراب ہے۔ کوئی چیز سچی نہیں۔ نہ سمجھنے کی خوبصورت سی ہنسی اور نہ انسانی چہرے کا ظاہری رکھ رکھاؤ۔

"بچے بھوکے ہوں گے کھڑے ماور۔" چمپا کلی نے سرگوشی میں کہا۔
"بچے کب بھوکے نہیں تھے چمپا کلی!"

اچانک وہ کچھ کھو گئی۔ اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چپ چاپ بہنے لگے۔ بہنے دے ان آنسوؤں کو چمپا کلی۔ دل کا میل دُھل جاتا ہے۔ بے بسی کو برداشت کرنے کے لئے بھگوان نے یہ بہت ہی خوبصورت چیز انسان کو دے ڈالی ہے۔ آنسو۔ اگر آنسو نہیں ہوتے تو کوئی کیسے جی لیتا؟

بڑی بھیانک رات ہے۔ ہوا ساکت، نگاہ ٹھہراتی ہوئی، دماغ ماؤف۔
رگ پر چھری کی تیز دھار۔
ارتقا کی تاریخ میں ایسی راتیں بہت کم گزری ہیں۔
سامنے کے مکان میں کلی کا بلب کب سے جل رہا ہے۔ میری آنکھیں اس بلب
کی طرف مسلسل دیکھتے رہنے سے ٹھہرا گئی ہیں۔ نگاہ کسی تیز نوک والی سوئی کی طرح کلی کے
بلب میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نگاہ کا دیوانہ پن۔
چوہے مکانوں سے نکل کر نیم اندھیری گلیوں میں بھاگ رہے ہیں۔

"اے کرڑے ماتو ـــ دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں چھپکلی ـــ آ"

"یہ کیا ہو رہا ہے کمڑے یار؟"

"شاید کوئی حادثہ ہونے والا ہے"

چھپکلی کو میری اس بات پر ہنسی آ رہی ہے۔ وہ ایک پھیکا سا قہقہہ مار کر میرے

باہر آ گیا۔ سرور اور لڑکی بھی میرے ساتھ باہر آ گئے۔ پھر میں نے دروازہ بند کیا۔ اور دروازے میں تالا ڈال کے چابی جیب میں رکھی۔۔۔ اُس رات جب لڑکی اور میں اُس غضبناک بارش میں بھیگتے ہوئے سڑک کے موڑ پر پہنچے تو ہم دونوں خود بخود رُک گئے میں نے پیچھے کھڈ میں دیکھا۔ مگر وہاں فقط اندھیرا تھا۔ پھر یہ اندھیرا دھیرے دھیرے میرے من میں گھس گیا۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر اس کھڈ میں پھینک دی اور پھر لڑکی کو گود میں لے کر زار زار رونے لگا۔ ○○○

اُس نے ایک بار آنکھیں کھولیں ۔۔ ایک بار مجھے بھرپور نظروں سے دیکھا۔
اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

بہت بھیانک رات تھی وہ ۔ میں رکھشا کو شعلوں کے سپرد کرکے آ گیا تھا۔
کمرے میں صرف وہ اسکارف رہ گیا تھا جسے رکھشا نے دن کو جلدی میں شاید گرادیا تھا۔
میں نے اسکارف کو اُٹھا کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ اتنے میں سردار ہاتھ میں دو
چکور لئے کمرے میں آ گیا۔

" شاہ صاحب ! خوش ہو گا "
" ہاں اُسے جلا کر ابھی آ رہا ہوں "
" وہ چڑیل کہاں گئی ؟ "
" کون رکھشا ؟ "
" جانے کیا نام ہے صاحب ! وہ ہنستر والی چڑیل ۔ خدا کی قسم میں نے اُس پر دو
فائر بھی کئے ۔ مگر بچ گئی "
" کس پر فائر کئے سردار ؟ "
" اسی چڑیل پر صاحب ۔ میں مارادن جنگل میں اِس سمت چکوروں کے پیچھے پیچھے
بھاگ رہا تھا کوئی چار بجے کے قریب جب وہ اندھیرا سا چھا گیا تھا ۔ اسی وقت
مجھے وہ دونوں نظر آئیں ۔ وہ بہت پیچھے سڑک پر جا رہی تھیں ۔ جب سڑک موڑ کے
پاس پہنچیں ۔ تو وہ دوسری لڑکی پیرا پٹ پر جھک کر نیچے جھانکنے لگی ۔ اور ایسے
میں اُس چڑیل نے اُسے دھکا دے کے نیچے کھائی میں گرا دیا ۔ میں نے دو فائر کئے "
ایک دم میں کھڑا ہو گیا۔
" کیا کہہ رہے ہو سردار ۔ " میں پاگل سا ہو گیا۔
" ٹھیک کہہ رہا ہوں صاحب ۔ میں نے تھانے میں رپٹ درج کرادی ہے "
میں نے مزید کچھ نہیں سنا ۔ جلدی سے برساتی کندھے پر ڈال دی اور بنگلے سے

بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک عجیب طرح کی سیلی سی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل میں جھینگر زور زور سے بول رہے تھے۔ اس لیے سردی بھی ایسی سندوقی لے کر عائب تھا میں اور راکی کمرے کے اندر آتشدان کے پاس ڈیک سے بیٹھے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور روشنی پھیلتے ہوئے برآمدے کے ایک حصّے کو سنگار کر رہی تھی۔ یہ وہ دن تھا جب بیماری مجھے تمام ہو گئی تھی۔

باہر کا پھاٹک مسلسل چرچرا رہا تھا۔ شاید ہوا کے کسی جھکڑ سے کھل گیا ہو۔ راکی رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر غرّا رہا تھا۔ اتنے میں رکھشا بھاگتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔ راکی ایک بار بھونکا ــ اور پھر وہ بدحواسی کے عالم میں اندر آگئی۔ اس کے سارے جسم سے پانی بہہ رہا تھا۔ بال سارے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

"جلدی چلئے۔ غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا۔" میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"دکھسا اُدھر کے موڑ سے پھسل گئی اور ــــ اور نیچے کھڈ میں جاگری۔"

"دکھشا!" میں زور سے چیخا اور ٹارچ ہاتھ میں لے کر ریٹ سڑک کی طرف بھاگا ــ بدحواسی کے عالم میں گرتا پھسلتا میں موڑ تک آگیا۔ میں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر دکھشا کو پکارا۔ مگر آس پاس صرف ہوا کا شور سنائی دیا۔ اتنے میں راکی کہیں پیچھے سے بھونکا۔ میں آواز کی طرف لپکا ــ اور پھر ہوا میں معلق ہو گیا ــ چیل کی شاخوں نے میرے کپڑے تار تار کئے ــ دور اوپر سے رکھشا کی آواز آرہی تھی ــ وہ اپنی بہن کو پکار رہی تھی۔

راکی نے اپنی تھوتھنی سے میری ننگی ٹانگ کو چھو لیا ــ میں نے جھک کر دیکھا ــ سامنے دکھشا پڑی تھی ــ اس کے جسم کے ہر حصّے سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے گیلے اور تار تار تھے۔ میں نے جھک کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا

"دکھشا!"

"دکھشا!"

"ناراض؟ نہیں تو۔۔ کیوں بھلا؟"

"وہ جو میں نے آپ کو نہ جانے کیا کیا کہہ دیا تھا؟"

کہا تھا میں بدمعاش ہوں۔۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ مجھے آپ کا ہاتھ پکڑنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

"ہاتھ پکڑنے میں کیا ہے؟"

"بہت کچھ ہے رکھتا۔۔ ہاتھ پکڑنے کا مطلب ہے کہ میں ساری عمر آپکا ہاتھ پکڑے رکھوں۔"

"تب بھی کیا ہے۔۔ یا تم نے آپنے خیال چھوڑ دیا؟"

پھر جانے کیا ہوا۔۔ میں نے ڈھکیل کر راکی کو کھیتوں کے پانی میں پھینک دیا اور گھٹنا کا ہاتھ پکڑ کر میں پگڈنڈی پر بیٹھ گیا۔۔ پھر میرے دل میں جھانکی ہوئی وہ گھٹنا کھلکھلا کر ہنسی اور ہم دونوں کے تن من ڈھلا گئی۔۔ راکی بھیگا بھیگا سا دُور پگڈنڈی پر بیٹھے ہوئے مینڈکوں کے ساتھ کھیلتا رہا اور کبھی کبھی چور نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔۔ جیسے کہہ رہا ہو

موج اُڑاؤ تم ادھر ابب تو تمہیں میری ضرورت نہ رہی۔۔۔

کھیتوں کے آس پاس اندھیرے کے حریری پردے منڈلانے لگے تھے۔ دُور گوجروں کے کھاروں سے دھوئیں کے لچھے آسماں کی طرف لپکنے لگے تھے۔۔ مگر ہمیں وقت اور اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔۔ اچانک راکی ڈھیرے سے غرّایا۔۔ ہم دونوں نے جھک کر دیکھا۔ سامنے رکھیا کھڑی تھی۔ اُس نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔۔ ہماری آنکھوں میں اُسے جانے کون سا پیغام نظر آیا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیر لیں اور بغیر کچھ کہے چلی گئی۔۔ ہم دونوں اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ اندھیرے کے پردوں میں چھپ گئی۔۔

اُس سے پیرس کا وہ شاید سب سے زیادہ منحوس دن تھا۔ صبح سے ہی آسماں کالے

پھر جانے کیا ہوا۔ ایک ساتھ کئی چیزیں ہو گئیں جھاکے سے کانچ کا کپ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ راکی لپک کر کرسی کے پیچھے سے باہر چلا آیا اور بھونکنے لگا۔ ہڑ بڑا کر لڑکی نے سامنے میں آکر دروازہ زور سے بند کیا۔

"چلو دیکھا۔ یہ تو کوئی بدمعاش لگتا ہے"

باہر کا پھاٹک زور سے چرچرایا۔ اور سرور ہاتھ میں لائیٹس لئے، بارش میں بھیگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"یہ کون لڑکیاں تھیں صاحب ؟"

"لڑکیاں ؟ ارے ہاں ، تھوڑا سا آگ مانگنے آئی تھیں"

"ہُنھ! جیسے اُن کے باپ کا گھر تھا۔ پہلے آگ مانگنے آتی ہیں۔ پھر گھر کی مالکن بن بیٹھتی ہیں"

صرف راکی تھا، جسے میری دراری کا علم تھا۔ سرور تو ٹھہرا سٹھاں کا بچہ۔ اُسے صرف دو چیزوں کی فکر رہتی تھی۔ ایک ایسے دو پانی والے مردوں کی اور ایک جنگل میں لوٹنے والے چکوروں کی۔ کیا مجال کہ رات کے دوجے کوئی چکور غلطی سے لوٹے اور سرور اپنے مردوں سے کر جنگل کی طرف نہ لپکے۔ اور ان دنوں چکوروں رات لوٹتے رہتے تھے۔ اور سرور اور لڑکا مردوں گھر سے باہر ہی رہتی تھی۔

لگتا تھا سارا سیزن ہی بارش نے ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ کبھی گھنٹہ بھر دھوپ نکل آتی تھی تڑمائی تڑمائی سی۔ اُس دن ایسی ہی تڑمائی تڑمائی سی دھوپ نکلی تھی میں اور راکی حسب معمول پگڈنڈی کے راستے مادی کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے رکھشا نظر آئی۔

"ہیلو !"۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"ہائی !" اُس نے چہک کر کہا اور جھک کر راکی کو سہلانے لگی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ شاید ناراض ہوں گے۔" اُس نے جھکے ہوتے ہی کہا۔

ڈرگئی ہے۔"

"ارے ہاں"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کرسی کے پیچھے ڈائی گر آیا۔ جیسے کہہ رہا ہو جاؤ کافی بنواؤ اور دفع ہو جاؤ۔ ایک بار پھر مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ آخر یہ کیا بات ہوئی کہ میں یہاں مارش میں بیکار ہوں، سردی سے کپکپا رہا ہوں اور وہ ہیڈ والی لڑکی میرے گھر کو گھسکاتی رہے جیسے اس کے باپ کی جاگیر ہو۔ میں صوفے پر جا بیٹھا۔ کیونکہ سردی اب ختم ہو چکی تھی اور رکھشا اندر گئی

"کافی پئیے گا۔ ؟"

"آپ ہی پلائیے۔ سردی اب آتا ہی ہو گا۔"

"ہم تو ہی کھا چکے۔ یہ آپ کے لئے لائی ہوں۔"

رکھشا نے مجھے کافی کا کپ تھما دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ بلیٹ اور اس پر دھرا ہوا کپ، تینوں چیزیں اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں ۔۔۔ اور پھر میں گویا بیہوش ہو گیا۔

"رکھشا۔"

"جی ایکٹیے۔"

"آپ کی دیدی کے سامنے میں شاید یہ مجھے دیکھا یا نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ کیا کیا چاہتے ہیں۔ میرا ہاتھ تو چھوڑ دیجئے۔"

"کیسے چھوڑ دوں گا ۔۔۔ اس ہاتھ کی ہی تو کہانی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ ؟"

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ ابھی ختم نہیں ہو سکتا، اس کے لئے پوری زندگی چاہئیے۔"

"اف اچانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ دیدی اندر کیا سوچ رہی ہوں گی۔"

" دیدی کچھ نہیں سوچ سکتیں ۔۔۔ کیونکہ انھوں نے شاید کبھی پیار نہیں کیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھی میرے قریب سے گزر کر کمرے میں چلی گئی۔ میں اور لڑکی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ـــ کچھ کچھ میں بھی حیران تھا۔ اور کچھ کچھ وہ بھی پریشاں تھا۔

"آدمی کہاں جا رہے ہے"

"ڈیڈی پلیز"

"جس آدمی کو آگ جلانا نہ آئے وہ اور کیا ہوتا ہے"

"ڈیڈی وہ سُن رہے ہیں"

"سُن رہا ہے تو کوئی پھانسی دے گا کیا؟"

کمرے میں جو باتیں ہو رہی تھیں، اُن کو شکر میری ہمت جواب دے گئی۔ اور میں برآمدے میں کرسی پر گویا ڈھیر ہو گیا۔

بارش کی پھوار میں برآمدے کے اندر آ کر مجھے پریشاں کرتی رہیں اور بے چارہ رائی کرسی کے پیچھے گھس کر کپکپاتا رہا۔

کئی بار میں نے سوچا کہ اٹھ کر کمرے میں چلا جاؤں گا اور ان دونوں بہنوں کو بالوں سے پکڑ کر باہر پھینک دوں گا ـــ دونوں بہنوں کو، نہیں نہیں صرف ایک بہن کو ـــ ہیٹ والی لڑکی کو ـــ دوسری لڑکی کے لیے تو ابھی میں نے میٹھ رسانا تھا اور اس کے تن من کو دھو ڈالنا تھا۔

"آپ کے ہاں کافی ہو گی ـــ" ہیٹ والی بہن نے برآمدے میں آ کر پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام رکھتا ہے ـــ اور میری ڈیڈی کا رکھیا ـــ آپ کے ہاں کافی ہے یا نہیں"

"ہو گی صاحب، ضرور ہو گی ـــ مگر وہ مرتوڑ۔ نہ جانے کہاں مر گیا کمبخت۔ ان جیروں کی جڑ آسے ہی رہتی ہے"

"پھر میں کچن میں جا کر دیکھ لوں؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں ضرور دیکھئے ـــ میں بھی چلتا۔ مگر وہ ـــ آپ کی ڈیڈی کا سے

میں دیر تک کھڑا اُسں کو جاتے ہوتے دیکھتا رہا، حتیٰ کہ دُور جا کر وہ آسمان کے ذرا ایک چھوٹا سا نکتہ بن کر رہ گئی

فاھی بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ میں کمرے میں آتشداں کے قریب میٹھا شعر داہا گلی لکڑیاں سلگنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ چوکیدار پیچھے بازار سے کچھ ساماں لینے چلا گیا تھا۔ اور برآمدے میں راکی ایک کرسی کے نیچے دُبک کر بیٹھا تھا۔ اچانک وہ کرسی کے نیچے سے نکل آیا اور دروازے کے پاس کھڑا ہو کر غور سے کچھ سُننے لگا۔

"راکی۔" میں نے اُسے آواز دی

ہُپ" جواب میں وہ ایک بار بھونکا۔

"ضرور ہوگا۔ اِدھر آؤ۔"

ہُپ" وہ دوبارہ بھونکا، جیسے کہہ رہا ہو میرے کام میں داخلت مت کرو۔ باہر کا پھاٹک چرچرانے کی ہلکی سی صدا آئی اور پھر راکی باقاعدہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بھونکنے لگا۔ میں بادلِ ناخواستہ کرسی سے اُٹھا اور دروازے کے قریب راکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں بارش میں بھیگی ہوئی دو لڑکیاں برآمدے میں آگئیں۔ ایک تو وہ مٹر والے کی بیٹی اور دوسری ___ آہ! اس دوسری لڑکی کی بات ہی اور تھی۔ لگتا تھا جیسے قدرت نے اُسے بارش میں بھیگنے کے لئے ہی بنایا ہو۔ محبت کی بارش میں۔

اچانک میرے دل میں گھنگھور گھٹا چھا گئی ___ ایسا لگا جیسے ابھی جل تھل ہوگا ___

"آپ ___؟" میں نے بیک وقت دونوں سے پوچھا۔ مٹر والی لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ میرے قریب سے گزر کر کمرے میں چلی گئی ___ اُس دوسری لڑکی نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا ___

"یہ میری ہمدردی ہیں۔"

"زندگی کی پگڈنڈی بھی تو تنگ ہی ہوتی ہے۔ مگر اُس پر دو آدمی چلتے ہیں۔"

"جی نہیں! زندگی بہت وسال ہے۔"

"زندگی مالکن وہ راستہ جس پر زندگی چلتی ہے، بس آساہی سادا تو ہوتا ہے۔"

"آپ کہتی ہیں تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔"

یکایک میں مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی۔ پگڈنڈی پھر سانس لینے لگی۔

"ٹھہریئے! میں کھیت میں اُترتا ہوں۔ آپ کے لئے راستہ بن جائے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کھیتوں میں کافی پانی ہے۔ آپ کے جوتے اور آپ کی پینٹ خراب ہو جائے گی۔"

"تو پھر آپ اُتریں گی کھیت میں؟"

"جی نہیں! تھوڑا سا آپ سمٹ جایئے، تھوڑا سا میں سمٹ جاؤں گی۔ دونوں نکل چلیں گے۔"

مگر سمٹتے سمٹتے میں ایسا توازن کھو بیٹھا اور پانی بھرے کھیت میں گر گیا۔

جب وہ جوب جی بھرکے ہنس چکی اور میں بھی اپنا حلیہ بگاڑ کر کھیت سے دوبارہ

پگڈنڈی پر آگیا۔ تو اُس نے اچانک پوچھا۔

"آپ کی شادی ہوئی ہے کیا؟"

"جی نہیں۔" میں کپڑوں سے پانی نچوڑتے ہوئے بولا۔

"جبھی تو۔"

"کیا جبھی تو۔" پانی میں گرنے سے میری ساری جھجک گویا دُھل گئی۔

"پانی میں گر گئے۔"

"پانی میں گرنے کا اور میرے شادی شدہ ہونے کا کیا تعلق ہے؟"

"اس بات کا جواب زندگی دے گی۔ جو بقول آپ کے وسال ہے، اور جو

بقول میرے ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتی ہے۔"

اور مجھے لفظوں کے اس گورکھ دھندے میں پھنسا کر وہ چلی گئی۔

"صرف ایک عدد دل — دل دے دیا ہے اس جگہ کے بدلے۔" میرا جواب سن کر
اُس نے ایک لمحے کے لئے اپنے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے چابک کی طرف دیکھا۔ پھر گھوڑے کی
لگام کو ایک زور کا جھٹکا دے کر اس کا رُخ پھاٹک کی طرف کر دیا پھر کاٹھی پر مڑ کر میری
طرف دیکھا — اور گھوڑے کے دو چار اچھے چابک مارے۔ گھوڑے نے ایک چھلانگ
لگائی اور سرپٹ بھاگتا ہوا دھول اُڑاتا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔
میرے کالی کے کیپ میں دھول کی ایک تہہ جم گئی — اُس وقت تو بات یہاں
تک ہی محدود رہی — مگر پھر یہ دھول میرے اندر گھس آئی اور میں ایک دم میلا
ہو گیا۔

اُس دن میں روز کی طرح اُس پگڈنڈی پر جا رہا تھا، جو بہت اندر جنگل کے
بیچ میں سے ہوتی باؤلی تک جاتی ہے — یہ پگڈنڈی مجھے پسند ہے، کیونکہ اس کے دونوں
طرف گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے دھان کے پودے دُور دُور تک بکھرے ہوتے
ہیں۔ پگڈنڈی کے کنارے کنارے ان گنت مینڈک اُچھلتے پھدکتے رہتے ہیں اور لگتا ہے
جیسے یہ پگڈنڈی سانس لے رہی ہے۔
مجھے یہ سانس لیتی ہوئی سی تو پسند ہے۔ میں پگڈنڈی کے اس اُتار چڑھاؤ میں
گم جا رہا تھا کہ ایک جگہ راستہ بند ہو گیا۔ کئی مینڈک پھدک کر دھان کے کھیتوں میں
کُود گئے۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو سامنے وہ کھڑی تھی — ہلکے سبز رنگ کی شلوار اور قمیص پہنے
بال گھٹاؤں کی طرح شانوں پر بکھرائے پلکیں جھکی جھکی سی، بدن سمٹا سمٹا سا چہرے پر شباب
چاندنی کا رقص سا۔
چند لمحوں تک پگڈنڈی نے جیسے سانس روک لی۔
"مکان تنگ جگہ ہے" اُس نے دھیرے سے کہا۔
"جی ہاں — تو صرف ایک آدمی کے چلنے کے لئے بنائی گئی ہے" میں نے مسکرانے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اُوپر کی جانب آتی نظر آئی۔ تن پر گھوڑ سواری کا لباس، ہاتھ میں چابک اور چہرے پر شوخی لئے۔ یہ لڑکی ہے یا پر والے کی بیٹی ؟ میں نے اپنے سامنے پڑے کانچ کے کپ سے پوچھا۔

وہ سیدھے بنگلے کی طرف آرہی تھی۔ بنگلے کے پھاٹک سے گزر کر اس نے گھوڑا آئے کے سامنے روک دیا۔

"اس بنگلے کا کیا کرایہ ہے ؟" اُس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈال کر پوچھا

میں اِس اچانک سوال پر چونک اُٹھا۔

"جی ؟ کرایہ ؟۔ یعنی ۔۔" میں بوکھلا گیا ۔۔ یہ میری بُری عادت ہے میں خوبصورت لڑکیوں کو اچانک سامنے دیکھ کر بوکھلا جاتا ہوں۔

"جی کرایہ! میں پورے سیزن کا کرایہ پیشگی ادا کردوں گی۔"

"آپ کو یہ جگہ شاید کافی پسند آگئی ہے۔"

"اتنی پسند نہیں کہ میں اسے خرید ہی لوں۔"

"خرید ہی لیتیں ۔۔ یعنی ؟"

"آپ نے سُن لیا، جو میں نے کہا ہے۔ میں ہر پسندیدہ چیز خرید لیتی ہوں۔"

"اچھا ؟"

"جی ہاں ایسا۔ کتنا کرایہ دینا ہوگا ۔۔ ؟"

"کرایہ تو بہرحال جو ہوگا سو ہوگا۔ اگر آپ کو یہ جگہ پسند ہے، تو اندر تشریف لائیے ۔۔ میں کسی اور جگہ چلا جاؤں گا۔"

"آپ ۔۔ یہاں رہتے ہیں ؟"

"جی ہاں بدقسمتی سے فی الحال میں ہی یہاں رہتا ہوں۔"

"کتنا کرایہ دے رہے ہو ؟"

"کرایہ تو بہت زیادہ دے رکھا ہے ۔۔ مگر کوئی بات نہیں، آپ تشریف لائیے ۔۔"

بہت زیادہ ؟ کتنا زیادہ ۔۔ ؟"

جانتا کیونکر ایسا ہو رہا ہے۔ بارہا میں نے اس دستک کو سننے سے انکار کیا، مگر انکار
مجھے جانا کہ اب مجھ میں مزاحمت کی طاقت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

او! یہ مسلسل دستک۔ مجھے جانا ہی پڑے گا کھڑکی کھولنی ہی پڑے گی۔ چاروں طرف
گھپ اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں، میں کوئی غیر مرئی ہاتھ تھامے اس چھوٹے سے بنگلے میں
داخل ہوں گا، جو پہاڑی کی ڈھلوان پر زرد کے پودوں سے گھرا ہوا ہے۔ دور سے اس کی سرخ چھت
نظر آتی ہے اور لگتا ہے جیسے کسی نے لال دوپٹہ میداں میں سکھانے کے لئے بچھا دیا ہو

اس بنگلے کی دوسری منزل میں ایک کمرہ ہے، جس کی تمام کھڑکیاں مدت سے بند ہیں، دروازہ
مقفل ہے۔ کمرے کے اندر ایک میلی کی، باسی سی خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں بے ترتیبی سے
ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک کرسی کی پشت سے ایک اسکارف لٹک رہا
ہے اور لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی تاں یہاں سے اٹھ کے چلا گیا ہے۔

مگر یہ سب ایک سراب ہے۔ نظر کا دھوکہ ہے، کیونکہ یہ کمرہ پچھلے پندرہ سال سے
کسی نے نہیں کھولا ہے۔ اس بنگلے کے باہر ایک زنگ آلودہ تالا اس بات کی گواہی دے گا۔
اور یہ تالا خود میں نے آج سے پندرہ برس پہلے بند کیا تھا اور چابی کسی کھائی میں پھینک
دی تھی۔

* * *

وہ دو نہیں تھیں۔ ایک تند رو پہاڑی ندی کی طرح پتھروں کو روندتی، اچھلتی
چھلکتی، جھاگ اڑاتی سی اور دوسری کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہر کی طرح کومل، آہستہ
خرام، جس کا بہاؤ گھاس کے ایک تنکے سے متاثر ہوتا ہے۔ لگتا تھا جیسے ایک کو کسی جاگیردار
باپ نے پالا ہو اور دوسری کو کسی شفیق ماں نے۔

سب سے پہلے میں نے پہاڑی ندی کو دیکھا۔ ان دنوں میں نے پہاڑی کی ڈھلوان
پر سجا ہوا یہ خوبصورت بنگلہ بہت سستا خرید لیا تھا، اور گرمیوں کے دن گزارنے کے لئے یہاں
چلا آیا تھا۔ اس دن میں برآمدے میں بیٹھا نشیب میں آگے ہوتے چیل کے درختوں کی
خوبصورتی دیکھ رہا تھا کہ وہ نشیب سے گھوڑے پر بیٹھی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتی

بےکھائی سے ساری رات

باہر بہت زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ صبح سے ہی آسمان کچھ اُداس سا،
کچھ معصوم سا نظر آ رہا ہے۔ جانے کیا بات ہے کہ جب آسمان اُداس ہوتا ہے تو میں بھی اُداس ہو جاتا
ہوں لگتا ہے میرے دل کے اندر آسمان کا کوئی ٹکڑا آ کے بس گیا ہے اِس ٹکڑے نے جو شاید میرے
کی ایک چھوٹی سی کمی کے برابر ہے، مجھے اجیرن کر دیا ہے کئی بار میں نے اِس ہیرے کی کمی کو دل سے
نکالنا چاہا مگر دل ہی زخمی ہو گیا کمی بدستور موجود رہی۔ اب آسمان روتا ہے تو مجھے بھی رونا
پڑتا ہے اور آسمان مسکراتا ہے تو میں بھی باغ باغ ہو جاتا ہوں میرا اور آسمان کا رشتہ
بہت پرانا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھگوان دُور ہے۔ بہت دور ہے!

بارش کے قطرے میرے کمرے کی کھڑکیوں پر مسلسل دستک دے رہے ہیں میں یہ
دستک نہیں سننا چاہتا تھا کیونکہ جب میں کھڑکی کھولوں گا، تو یہ دستک مجھے کہیں لے جائے گی
۔ لیکن اب میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا میں بہت تھک گیا ہوں۔ انگ انگ تھکن سے چور
ہے روم روم ہانپ رہا ہے
مگر بس اس کھڑکی کھولوں گا۔ اور پھر اس دستک کا ہاتھ تھامے وہاں چلا

ں کار کے ہونٹوں پر ایک سحر زدہ مسکراہٹ بدستور قائم ہے۔ اُس پر تو کسی طلاطم
کا اثر ہی نہیں ہو رہا۔
پھر ایسا ہوا کہ میں نے ڈر کے مارے دوبارہ اپنے وجود کا لبادہ اوڑھ لیا۔۔
۔۔۔ اور اسی لمحے وہ سامنے نمودار ہو گئی۔ میں پہچان تو گیا، پر پہچان نہ سکا۔ ملتے
رجید لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ لکیریں جو تھیں۔ لکیریں جو نہیں بھی تھیں۔۔ یعنی اس کا وجود
تھا۔ اور وجود نہیں بھی تھا۔۔ میں پریشان ہو گیا۔۔

پہچانا۔۔؟
ں کار نے پوچھا۔
کچھ کچھ۔
میں نے جواب دیا۔
چلو اٹھو۔۔ تمہیں تو مجالِ جواب بھی نہیں۔۔ مجالِ دیدار کہاں سے ہو گا۔ ں کار
نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔ اور بازو پھیلا کر خلاؤں میں پرواز کر گیا۔

★★

دیسی گھی کھاتا ہوں اور ولائتی
بھنگائی بھی اصلی ہے اور پرانس انڈکس بھی اصلی ہے۔
شراب پیتا ہوں۔ بولو انقلاب زندہ باد۔
میں آگے بڑھ گیا۔ اور تیسرے انسان کا بار دیکارڈ لیا۔ بھائی ایک بات
بتاؤ۔ کیا تم نقلی ہو۔؟ اُس نے ڈر دیدہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ کر دھیرے
سے کہا۔ بات سنو۔ اگر کچھ دینا ہے تو اُس گلی میں چلو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے
ہیں۔ اور ہر چیز کے دام ہوتے ہیں۔ میڈیکل کالج میں داخلہ چاہتے ہو پندرہ ہزار
نکالو۔ انجینئر بننا چاہتے ہو تو پورے پندرہ ہزار دیدو۔ نوکری حاصل کرنا چاہتے ہو
تو ریٹ الگ الگ ہیں۔ جس طرح گریڈ الگ الگ ہیں۔ بولو۔ کیا چاہتے ہو؟
میں ایک جست لگا کر دور نکل گیا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے کئی انسانوں کے
ہاتھ تھام لئے۔ ایک مذہبی رہنما کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ کیا تم بھی نقلی ہو۔؟ اُس
نے مسکرا کر کہا۔ تم بھٹک گئے ہو پیارے۔ میرا مندر اصلی ہے۔ مورتی اصلی ہے چڑھاوا
اصلی ہے۔ مرادیں اصلی ہیں۔ مرادیں مانگنے والا اصلی ہے۔ سوا روپیہ نکالو اور اصلی پرشاد
حاصل کرو۔ اکیس روپے نکالو اور اصلی مورتی کے درشن کرو۔ میں بھاگ کھڑا
ہوا۔ دور نکل گیا۔ دیکھا تو سامنے ایک مداری کھڑا تھا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔
اُس نے اپنی ڈگڈگی بجائی۔ پھر اپنی چھڑی گھمائی۔ ایک کبوتر نمودار ہو گیا۔ دوبارہ
چھڑی گھمائی تو ایک خرگوش اُچھلتا کودتا سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار اور چھڑی
گھمائی تو ایک موٹر سائیکل سامنے آگئی۔ پھر ایک خوبصورت عورت۔ پھر ایک
مکان۔ پھر ایک آم کا درخت۔ پھر ایک بارہ دری، ایک آبشار۔ ایک کل کل
کرتی ہوئی ندی۔ میں حیران اور ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ اتنے میں اُس نے
ہاتھ بڑھایا۔ ایک روپیہ نکالو۔ میں نے ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی
پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا تم نقلی ہو۔؟ اُس کے ہونٹوں پر ایک خفیف
سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اپنی پٹاری کھولی۔ ڈگڈگی اور چھڑی اُس میں
ڈال دی۔ پٹاری کو بند کیا اور چلا گیا۔ دوسرے لمحے میں نے دیکھا۔ تو کچھ بھی

دیع کیسے ہوگا سیٹھ جی۔ پولیس کو خبر کردے تو— کوئی کارندہ چلایا—
تم ٹھیک کہہ رہے ہو تیون— یہ کہہ کر بندوق کی نالی ہوا میں لہرائی، ایک
شعلہ بلند ہوا، دھماکے کی آواز سنائی دی— اور بس۔
اور تم نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا؟ انھوں نے پوچھا— کیسے؟
ہاں جی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میں مزدور ہوں کر تین مہینے سے اس گودام میں کام
کر رہا ہوں۔
اچھا۔ تم جاؤ—
دوسرے دن جو خبر چھپی تو پتہ چلا کہ سیٹھ دولت رام نے اپنے گودام میں تجوری
کھول کے مزدوری کا حساب دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں منشی دیاکشن اندر آ گیا اور تجوری
کھلی دیکھ کر اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی— اس نے سیٹھ جی پر حملہ کر دیا۔ سیٹھ جی نے
بندوق اٹھا کر اسے ڈرانا چاہا— دونوں گتھم گتھا ہو گئے— اور ایسے میں بندوق
چل گئی۔ قیاس ہے کہ بندوق کی گولی منشی دیاکشن نے ہی چلائی تھی۔ سیٹھ جی بے ہوش ہو گئے
ان کو ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا ہے۔
میں نے پوچھا۔ یہ کیا، اتنا بڑا جھوٹ؟ انھوں نے کہا یہی سچائی ہے۔
—تم پاگل ہو گئے ہو، اپنا علاج کرا لو— چنانچہ تین سال کے بعد جب میں پاگل
خانے سے باہر آیا تو میری سچائی چھن گئی تھی— اور یہ راز مجھ پر آشکار ہوا تھا کہ سچائی کے
تلاؤ دور دور تک جا کر خلط ملط ہو جاتے ہیں— کہ سچائی کو پوشاک پہنانا انسان اور
سماج دونوں کے لئے ضروری ہے۔

وقت آتا
ہے۔ ا
ڑی
مد

طاقت، وہ کائنات کی ازلی حرکت ایک
۔ دل کے شیشے میں نظر آنے والی محبوبہ
قریب آنکھیں جھپکاتی ہے اور افق
ی کائنات میں پھول کھل اٹھتے ہیں
ح روشن طرح ترتو—

پائے جاتے ہیں۔ کچھ شدید سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں، کچھ شدید گرمی سے تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ کچھ دھن دھاتی ہوئی لاریوں کی زد میں آکر مر جاتے ہیں۔ اور کچھ۔ خواہ مخواہ مر جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ پوچھنا خطرناک ہے ۔۔۔ جواب میت تلاش کیا کرو ۔۔۔ میں کار بے آواز دی ۔۔۔ یہ میں کار میرے خیالات کی پڑھ لیتا ہے تعجب ہے۔

اس کے بعد انھوں نے میری سچائی چھین لی ۔۔۔ میں نے اُن کی لچھے دار باتوں پر اعتبار کر کے اپنی طاقت ان کے حوالے کی تھی ۔۔۔ دن بھر سڑکوں پر آوارگی کرتے کرتے اپنی نظروں کی دوربین لئے، اور اپنے کانوں کا ٹیپ ریکارڈر لئے میں خبریں جمع کر کے ان کے حوالے کرتا رہا ۔۔۔ قتل کی خبریں، اقتصادی خبریں، مذہبی خبریں، سماجی خبریں، اغوا کی خبریں ڈکیتی کی خبریں، سیاسی خبریں، غیر مذہبی خبریں، لامذہبی خبریں ۔۔۔ جب سیٹھ دولت لال نے اپنی مالا فسس سدرش سے اپنے کارندے منشی دیاکشن کے سینے میں گولی اُتار دی تو میں وہ خبر لے کر دوڑا دوڑا پسینے میں شرابور دکان کے پاس پہنچا۔

اچھا، تمہیں کیسے معلوم؟ ۔۔۔ انھوں نے پوچھا۔

خود دیکھ کے آیا ہوں۔ منشی دیاکشن سیٹھ جی کے گودام میں تھا۔ گودام میں کام زور و شور سے چل رہا تھا ۔۔۔

گودام؟ ۔۔۔ کام زور و شور سے چل رہا تھا، کیا کہتے ہو؟

ہاں جی! کام زور و شور سے چل رہا تھا ۔۔۔ سیمنٹ کی بوریوں سے دس دس بارہ بارہ کلو سیمنٹ نکال کر خالی بوریوں میں ڈالا جا رہا تھا ۔۔۔ بوریاں دوبارہ سی کر بند کی جا رہی تھیں ۔۔۔ کہ اچانک منشی دیاکشن دونوں ہاتھ اُٹھا کر چلایا ۔۔۔ بس کرو یہ کیا ہوا ۔۔۔ بہت ہو گیا ۔۔۔ کام بند ہو گیا۔ کسی نے سیٹھ جی کو خبر کر دی ۔۔۔ دھمکی لے کر آگئے ۔۔۔

یہ کیا بدتمیزی ہے دیاکشن؟

بہت ہو گیا سیٹھ جی ۔۔۔ اب بس کرو۔

کیا کہتے ہو؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے ۔۔۔ نمک حرام۔

ہمیشہ باقی رہے گا۔

فنکار نے مجھے دوبارہ آواز دی۔ کون تھا۔؟ ایک اور سوال۔ جیسے پہلے سے موجود تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا جواب دینے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ میرے سامنے تھی۔ جیسے دھرتی۔ جیسے وسیع و عریض آسمان۔ جیسے چاند ستاروں کی محفل رقص و سرود۔ آنگ سے بہتی ہوئی گنگا۔ زمین تمام سے مانگا ہوا کامل کا عشار۔ وہ میرے سامنے تھی۔ اور میری آنکھیں بند تھیں۔ اور میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے۔

اس فنکار کو میں ایک دن بیابانِ تلاش کے بعد اٹھا کر گھر لے آیا تھا سوچا تھا یہ اپنے طلسم کے ذریعے میرے بہت سارے سوالوں کے جواب فراہم کرے گا۔ ان گنت سوال تھے جو انگاروں کی طرح میرے ذہن کے طاقوں میں سلگ رہے تھے۔ اس دن میں دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ میں نے دریا کے کنارے ٹہلنے کا شعار اپنایا تھا کیونکہ شاہراہوں پر راہزن ڈیرہ ڈھالتے پھر رہے تھے۔ میں بھی کچھ ان راہزنوں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے میری معصومیت چھین لی تھی۔ میں نے ان کے مسکراتے ہوئے چہروں پر اعتماد کر کے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک انسان کی لاش پڑی تھی۔ میں نے پوچھا تھا یہ۔ یہ انسان کیسے مر گیا۔ ادھر سڑک کے کنارے۔ اگر اسے مرنا ہی تھا تو یہ گھر میں کیوں نہیں مر گیا۔ اپنی بوڑھی ماں کی گود میں سر رکھ کر۔ اپنی کم مایہ محبوبہ کے زانوں پر سر رکھ کر۔ اپنے ننھے منے بچوں کے درمیان۔ یا اپنی بیوی کے سامنے گھر کے آنگن میں۔ یہاں کیوں مر گیا سڑک کے کنارے۔؟ مسکراتے ہوئے چہروں کی مسکراہٹ کا زاویہ تبدیل ہو گیا۔ تو گویا تم اس شخص کو جانتے ہو۔ تمہیں اس کے گھر کی واقفیت بھی ہے۔ تم اس کی ماں بیوی بچوں کو بھی جانتے ہو۔ تمہیں اس شخص کے قتل کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ بارہ سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار کر جب میں باہر آ گیا تو میری معصومیت چھین لی گئی تھی۔

۔۔۔ اور مجھ پر یہ راز عیاں ہو گیا کہ شاہراہوں پر انسان اسی طرح مرے ہوتے

تو بھی ناری بھی

اچانک سامنے نمودار ہوگئی۔ میں پہچان تو گیا، پر پہچان نہ سکا۔ اتنے بر
چند لکیریں نمایاں ہوگئیں۔ لکیریں جو تھیں۔ لکیریں جو نہیں تھیں۔ یعنی اِس کا وجود تھا
اور وجود نہیں بھی تھا۔ میں پریشان سا ہوگیا۔

میں کارنیس کی چھت پر برستی ہوئی بارش کی جل ترنگ سننے میں محو تھا۔
اچانک اُس نے مجھے آواز دی۔ باہر اُڑتے ہوئے قد والے چند سفیدے کے درخت
ہواؤں کے دوش پر جھوم رہے تھے۔ ہائے کیسی والہانہ حرکت ہے۔ کیسی سرملند
سرمستی ہے۔ میں اس لمحے کو اپنے بہت اندر کہیں محفوظ کر رہا ہوں کسی قیمتی دستاویز کے
جیسے ہوا چاروں طرف سے بند ہوگی، سانس لیتے وقت چھاتی میں درد اُبھرنے لگے گا
دیواروں کو پسینہ آنے لگے گا۔ اس وقت میں اپنے بہت اندر سے اس لمحے کو نکال
کر ہتھیلی پر رکھوں گا۔ مقام کوئی اور ہوگا۔ مکاں کوئی اور ہوگا۔ اور شاید میں بھی
کوئی اور ہوں گا۔ یہ سرملند سفیدے کے درختوں کا رقص۔ یہ ہوا کی تال پر ناچنے کی
کیفیت۔ وقت کی قید سے آزاد۔ میرے خیالوں میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے اسا

ہسپتال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گونجتی چلی گئی
مسز گسگولی کا ہاتھ سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح چارپائی کے ایک طرف
لٹک گیا تھا

★★★

بہت سخت جان ہوں۔ آسانی سے نہیں مر سکتا۔ جانتی ہو کیا ہوا؟ دو دن پہلے
سڑک پر مجھے اچانک سواری لال کیمونڈر ملا میں نے پہچانا نہیں۔ کیسے پہچانتا؟
بیس سال ہو گئے تھے اُسے دیکھے ہوئے۔

"ڈاکٹر گنگولی!" اُس نے آواز دی۔ میں نے آواز پہچان لی۔

"ارے سواری لال تم ___؟"

"ارے ڈاکٹر صاحب اتنے بُزدل ہو تم نے یہ پاپ کیا ہے!" اُس کی
آنکھیں بھر آئیں

"کیا کہہ رہے ہو سواری لال؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ڈاکٹر ___ تم نے اُسے تباہ کر دیا برباد کر دیا۔ وہ
اب بھی کٹیا پر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ آہٹ سنتی ہے تو کہتی
ہے ڈاکٹر بابو آ گئے ___!"

"کیا کہہ رہے ہو سواری لال ___ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم
کس کی بات کرتے ہو؟"

"تنالو کی بات کر رہا ہوں ڈاکٹر ___ جب سے اُس کی شادی
نہیں ہو سکی تھی۔ تو کشتی ہار گیا تھا نا ___"

نرس ___ یہ ٹھنک زور زور سے کیوں بجنے لگا ہے ___ بند کرا دو
یہ شور۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ وہ دیکھو تنالو کٹیا پر بیٹھی ہے ___ کان
آہٹ پر لگائے، آنکھیں راہ میں بچھائے۔ بیس سال سے بیٹھی ہے بہت
بردتی ہوں میں ___ آ رہا ہوں تنالو ___ آ رہا ہوں۔ نرس! مجھے
گھر نہیں دکھائی دے رہا ہے ___ یہ میرا گلا کیوں دبا رہی ہو نرس؟
ہاں ذرا زور سے دباؤ ___ میں ___ میں ___

"ڈاکٹر ___!" نرس کی چیخ رات کے پردوں سے ٹکرائی اور

ہونٹ کاٹ لئے میرے دل پر ساری پہاڑیوں کا بوجھ آن گرا۔ اُس دن میں شانو
سے ملنے گیا۔ وہ زخمی تیتری کی طرح تلملا رہی تھی
"میں کچا چبا جاؤں گی اس بڈھے کو۔ جلا دوں گی اس منہ نوچ لوں گی ——"
میلے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ شیخ حیدر کو سمجھایا گیا، دھمکایا گیا۔ تنی ہوئی
کمان کی طرح اکڑ گئی ——— آخر ٹھکیا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سرپنچ دیر تک شانو کو
سمجھاتا رہا۔
"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب غضب ہو گیا۔ شانو ماں گئی ——!"
سواری لال کمپونڈر شام کو ہانپتا کانپتا چلا آیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے
دل میں کوئی رگ ہلکی سی آواز پیدا کر کے کٹ گئی —— گرتے پڑتے میں شانو سے
ملنے گیا۔
"ڈاکٹر بابو سرپنچ کہہ رہا تھا اگر میں تم سے شادی کر دوں گی، تو صرف
تمہارے اور میرے پیار کا بھرم قائم رہے گا —— اور اگر میں حتو سے شادی کر دوں گی
تو سارے گاؤں کا بھرم قائم رہے گا —— میں —— میں ——"
شانو کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میرے کان بہرے ہو گئے۔ میری آنکھیں اندھی
ہو گئیں میں وہاں سے بھاگ آیا۔
"ڈاکٹر صاحب مت جاؤ۔ حتو کشتی نہیں جیتے گا۔ میں ابھی جا کر اسے سنکھیا
کا انجکشن دے آؤں گا۔ میں اُسے پھانسی پر لٹکا دوں گا —— تم مت جاؤ ڈاکٹر ——
مت جاؤ ——!" لیکن سواری لال کمپونڈر کے آنسوؤں کی روشنی میں، میں اُس
گاؤں سے بھاگ آیا۔ میں نے بازی ہاری تھی نرس! اب وہاں رہ کر کیا کرتا۔ ارے!
تم پھر میری سمت دیکھ رہی ہو؟ لیکن میری سمت تو پانچ منٹ پہلے کٹ گئی ہے اب
مجھے صرف تمہارا ہیولا نظر آ رہا ہے۔ دھندلا سا۔ بس اب چلا چلی ہے۔
تم نہیں جانتیں نرس، یہ بیس سال میں نے انگاروں پر لوٹ کے کاٹے ہیں۔

دیکھ رہی ہو، پگلی!

یہ گھڑی گھڑی یاری سس دیکھنا اچھا نہیں ہوتا۔

اچھا مجھے یہ بات پوری کرنے دو، پھر میں نہیں بولوں گا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ دن ہماچل کی تاریخ کے سنہرے دن تھے معلس یکے لگیں تو گاؤں میں جمع کے میلے کی تیاریاں ایک بار پھر ہونے لگیں۔ پہلوان اکھاڑے میں ڈنڈ پیلنے لگے، گلی جھنڈیاں بیچنے والے اپنے سمو مرمت کرنے لگے۔ ٹمک کے ڈولوں پر نئے چمڑے منڈھے جانے لگے۔ پہلوانوں کو نیوتے گئے۔ آس پاس کے سارے گاؤں اپنے اپنے پہلوانوں کی پیٹھ ٹھوکنے لگے۔ میلہ لگنے میں صرف چند روز باقی رہ گئے تھے کہ گاؤں کا پہلوان فتح چند آنکھیں پھیرنے لگا۔

"سرپنچ جی میں اگلے اکھاڑے میں نہیں اتروں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا فتح چند یہ گاؤں کی عزت کا سوال ہے۔"

"نہیں سرپنچ جی، سال میں ایک بار یہاں لوگوں کو میری موجودگی کا احساس ہوتا ہے باقی وقت میں کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ فتو تم زندہ ہو کہ مر گئے۔"

فتح چند اکڑ گیا۔ گاؤں والے منت سماجت کرنے لگے۔ مکھیا الگ پریشان تھا پنچایت والے الگ پریشان تھے۔ آخر فتح چند نے کہا کہ وہ ایک شرط پر اکھاڑے میں اترے گا۔

"ہمیں ساری شرطیں منظور ہیں۔" سرپنچ نے وعدہ کیا۔

"میری شرط یہ ہے کہ میری شادی کرا دیجیے۔"

"ضرور کرا دیں گے۔ جس لڑکی سے تم چاہو گے، اس سے کرا دیں گے۔ بھلا یہ کوئی بات ہوتی۔"

"تو پھر میری شادی شانو سے ہی کرا دیجیے۔"

دھم سے آسمان دھرتی پر گر آیا۔ مکھیا نے صاف انکار کیا۔ شانو نے غصے سے اپنے

"ڈاکٹر صاحب! سانو بڑی منہ پھٹ لڑکی ہے۔ کسی کی عزت کا خیال نہیں کرتی۔ لعنت بھیجئے۔"

ایک دن کمپونڈر سواری لال نے کہا۔ تو کیا میں محبت کا جیتا جاگتا اشتہار بن گیا ہوں۔ تو کیا اب میرے دل کا حال میرا کمپونڈر بھی جان گیا ہے؟ اس رات میں نے واقعی اپنے وجود پر لعنت بھیجی۔ کئی دن ہسپتال سے باہر نہیں آیا۔۔۔ ایک دن جب میں ہسپتال میں مریضوں کو دیکھ رہا تھا تو سانو آ کر سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی

"ڈاکٹر بابو! کل رات سے بڑا زکام ہے۔ کھانسی آتی ہے اور رات کو نیند بھی نہیں آتی۔"

میں نے نبض ٹٹولی۔ لیکن میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ میری اپنی نبض ڈوبنے لگی۔ اس نے عصاک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور جھٹک کر بازو میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"بخار نہیں آتی؟" اس نے نفرت سے کہا۔

"سانو۔" میں نے دھیرے سے التجا کی۔ اف! وہ کمپونڈر سواری لال دور کھڑا ہنس رہا ہے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں عیاں ہو گئیں کئی لمحے گزر گئے کہ ہاں بولا مجھے!

"ڈاکٹر بابو! مجھ سے شادی کرو گے۔۔۔؟" اچانک اس نے پوچھا میرے کانوں میں چھوٹی چھوٹی چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔۔۔ میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے فوراً نگاہیں نیچی کر لیں۔ میں نے دیکھا اس کا ہاتھ اس کی گود میں کانپ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر حیرت سے شفق اتر آئی تھی۔ حیا اور ترنم کا ایک حریری آنچل اس کے ماتھے پر ڈھلک آیا تھا

"ہاں سانو۔" میں نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔۔۔

"تو چلو ماں کے پاس۔" اس نے کہا اور ایک ہی جست لگا کے کمرے سے

بھاگ گئی۔

پھر آمی دروازے سے بہار جھکیے سے آ کر میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ پھول کھلے۔ ہماچل کی گھاٹیاں جوان ہو گئیں۔ چائے کے باغات مہک سے بھر گئے۔ دودھ بھری آنکھوں کا خمار بھار پر چھا گیا۔ بادلوں کی گھٹا میں فضا کے تالوں پر گر آئیں۔ بارشوں کی گولائیوں نے دھرتی کی وسعت اپنے حلقوں میں بھر لی۔ جھرنوں نے اپنی ساری موسیقی میرے اور تنا تو کے لئے وقف کر دی۔

"تنا تو، یہ پھلیں کیوں نہیں کیتیں؟"

"ارے ڈاکٹر، یہ پھلیں ابھی دیر میں پکیں گی۔"

"پھر تیری میری شادی بھی دیر ہی میں ہو گی۔"

"دھت بے شرم ہو جی!"

اوپر آسمان پر چاند کے چہرے کو بدلی نے ڈھک لیا۔

"تنا تو، کٹس میں تمہارے چلوں گا۔ شہر میں بہت اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔"

"ارے ڈاکٹر جی، شہر میں کیا اچھی چیزیں ہوں گی۔ تم سے اچھی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔"

شفق کے گالوں پر لالیاں کھنڈنے لگیں۔

"تنا تو، میں تم سے اتنا پیار کر رہا ہوں اور تم صرف جلی کٹی سناتی ہو۔"

"ڈاکٹر، پیار جتانے والی بات تو نہیں ہوتی، دل میں رکھنے والی بات ہوتی ہے۔ اگر میں کبھی بیمار ہو جاؤں، تو میرے دل کا آپریشن کرنے کے بعد خود دیکھ لینا۔"

برس اور اِس صدی کے بہترین دن تھے۔ وہ ہماچل کی تاریخ کے بہترین دن تھے۔ ارے! تم یہ بار بار میرے ماتھے کو اور میری ناک کو چھو کر کیا دیکھ رہی ہو؟ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ کہیں میں بہکی بہکی باتیں تو نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تم میری نبض کیوں

"ڈاکٹر صاحب اسالو بڑی تمہ یعنٹ لڑکی ہے۔ کسی کی عزت کا خیال نہیں کرتی ___ لعنت بھیجئے۔"

ایک دن کیمپوڈر سواری لال نے کہا۔ تو کیا میں محبت کا جیتا جاگتا اشتہار بن گیا ہوں۔ تو کیا اب میرے دل کا حال میرا کیمپوڈر بھی جان گیا ہے؟ اس رات میں نے واقعی اپنے وجود پر لعنت بھیجی۔ کئی دن ہسپتال سے باہر نہیں آیا ___ ایک دن جب میں ہسپتال میں مریضوں کو دیکھ رہا تھا تو تنالو آ کر سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"ڈاگدر بالو اکل رات سے بڑا زکام ہے۔ کھانسی آتی ہے اور رات کو نیند بھی نہیں آتی۔"

میں نے نبض ٹٹولی۔ لیکن میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ میری اپنی نبض زور سے لگی۔ اس نے عصباک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور جھٹک کر مارد میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"ترم نہیں آتی؟" اس نے نفرت سے کہا۔

"تنالو" میں نے دھیرے سے التجا کی۔ آف! وہ کیمپوڈر سواری لال دور کھڑا ہنس رہا ہے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں عیاں ہو گئیں کئی لمحے گذر گئے۔ کئی جان لیوا لمحے!

"ڈاگدر بالو! ہم سے شادی کرو گے ___؟" اچانک اس نے پوچھا۔ میرے کانوں میں چھوٹی چھوٹی چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں ___ میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے فوراً نگاہیں نیچی کر لیں۔ میں نے دیکھا اس کا ہاتھ اس کی گود میں کانپ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر جیسے شفق اتر آئی تھی۔ حیا اور ترنم کا ایک حریری آنچل اس کے ماتھے پر ڈھلک آیا تھا

"ہاں تنالو" میں نے تھرتھراتی آواز میں کہا ___

"تو چلو ماما کے پاس۔" اس نے کہا اور ایک ہی جست لگا کے کمرے سے

یہ تھا نو کتی نکھیا کی بیٹی۔

شام کو ایک چارپائی پر پڑے پڑے میں نے سوچا مجھے یہاں بیماروں کا علاج کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن میں تو خود ہی بیمار ہو گیا! اب ڈاکٹری کیسے چلے گی؟

ایک دن اُسے بازار میں دیکھا، چھوٹا سا بازار تھا، چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں وہ بے پروائی سے جا رہی تھی ہاتھ میں گھڑی لئے ـــ میں نے دل میں کہا، اس کی کیا ضرورت تھی۔

ایک دن اُسے نہر کے کنارے دیکھا پاؤں پانی میں ڈالے میٹھی دانتوں سے ماچس کاٹ رہی تھی میری طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ میں نے دل میں کہا، اتنا غرور!

ایک بار جاتے کی جھاڑیوں کے بیچ میں چل رہی تھی، ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے میں کسی مریض کو دیکھ کر آ رہا تھا جب وہ نکل سامنے پہنچی تو میری سانس رُک گئی ـــ

"کیا دیکھ رہے ہو ڈاکٹر بابو! پہلے کبھی لڑکی نہیں دیکھی ہے؟" میں اس اچانک حملے سے بوکھلا گیا میں نے نفی میں سر ہلایا وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں پسینے میں تر بتر ہو گیا۔

ارے، یہ تم کیا کر رہی ہو نرس، میرا ماتھا کیوں پونچھ رہی ہو؟ ـــ وہ پسینہ اور تھا، یہ پسینہ اور ہے میں جانتا ہوں اس پسینے کے معنی کیا ہیں اسے بہنے دو نرس۔ اسے بہنے دو۔

ایک دن چشمے پر ملی۔ میں نہانے گیا تھا۔ اُس کی طرف دیکھا تو نہانا بھول گیا۔ "مجھے دیکھ کر تمہارے ہاتھ پاؤں کیوں بھول جاتے ہیں ڈاکٹر بابو! جاؤ میدانوں سے ایک دُلہن لے آؤ، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا" اُس نے منہ بنا کر کہا اور میں چشمے کی گہرائی کا اندازہ کرنے لگا۔

کیسا میلہ۔؟"

کشتیوں کا۔ آس پاس کے گاؤں سے پہلوان کشتی کے مقابلے میں حصہ لینے آئے ہیں کل آپ کو دکھانے لے چلوں گا۔"

"نہیں سواری لال آج ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور قلی سے سامان استعمال پہنچانے کے لئے کہہ کر ہم میلہ دیکھنے گئے۔ ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے ایک طرف کریوا تھا اور دوسری طرف ایک ٹیلہ۔ میدان میں ایک اکھاڑہ بنایا گیا تھا۔ کریوا پر عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ٹیلے پر مرد۔ کچھ لوگ اکھاڑے کے گرد کھڑے تھے میں نے اکھاڑے سے ٹیلے تک اور پھر ٹیلے سے کریوا تک ایک جھلملی نظر ڈالی رنگ برنگی قمیصوں، شلواروں، ماتوں اور دوپٹوں کا ایک سیلاب بالکل کے دائرے میں آ گیا بھولی بھالی صورتیں، سہمے سہمے سے چہرے، طرح طرح کی آنکھیں۔ کوئی بچہ تالی بجا رہا تھا کوئی آمی حاٹ کھا رہا تھا، کوئی عورت کانچ کی چوڑیاں پہن رہی تھی ادھر آنکل ڈھلکا، ادھر چادر سرکی۔ دو وہ پہلوان چاروں شانے چت گرا۔ تالیوں کی آواز گونجی کوئی موتیوں کی لڑی دمک گئی۔ قوس قزح کے رنگ۔ اور دیکھتے دیکھتے اچانک مجھے دو آنکھیں نظر آئیں کریوا پر جھلکتی ہوئی سینکڑوں آنکھوں میں سے صرف دو آنکھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ ایک وحشی سی چمک دامت گئے کو چھیل رہے تھے۔ بادلوں کی گولائیاں تی کانچ کی چوڑیوں کو سہلا رہی تھیں۔ کانوں کے بندے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری چیزیں دھندلا گئیں اور صرف دو آنکھیں باقی رہ گئیں۔ وہ وحشی سی آنکھیں اور دہلتے ہوئے بندے، ہونٹوں کے کونے گئے کے رس میں ڈوبے ہوئے۔ کشتی ختم ہو گئی۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے۔ پاؤں حرکت کرنے لگے۔ ننگے پاؤں، میلے پاؤں۔ نئی چپلیں، پرانے جوتے، مہندی سے رنگے ہوئے پاؤں، گرد سے اٹے ہوئے پاؤں۔ پھر دو وحشی آنکھیں نظر آئیں پاؤں حرکت کرنے لگے، جھانجھیں بجنے لگیں۔ چھم چھم، چھم چھم!

ارے نہیں رس! تم نے خود غلط سمجھا ہے۔ ڈاکٹر کمل نے مجھے نہیں تمہیں زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔ تم زیادہ مت بولو۔ لو میں تمہیں ایک روپ دیپالا کی کہانی سناتا ہوں ——
کہتے ہیں، ایک دن دھرتی کی دیوی پیرتر کی مٹی ردور دیا —— کیا کہتی ہو؟ میرے دل کی حالت تسلی بخش نہیں ہے؟ لیکن! میرے دل کی حالت ایک مدت سے تسلی بخش نہیں ہے۔ پھر میں زندہ کیسے رہا؟ کس امید پر؟ کس ارمان کے سہارے؟ کوئی بہار نہیں تھی زندگی میں کوئی خوشبو نہیں تھی۔ کوئی پھولوں کا رنگ زردیب نہیں تھا۔ بہاروں کی شہزادی کو تو بہت دن پہلے موت کا دیوتا اُٹھا لے گیا تھا۔ اب صرف ایک بھیانک خزاں ہے سارے ارمان سوکھے پتوں کی طرح جھڑ گئے ہیں۔ جانتی ہو؟ اُس کا نام شانو تھا۔ وہ جب سانس لیتی تھی تو دیودار کے جنگلوں کی مسحور کن خوشبو ساری فضا پر چھا جاتی تھی وہ جب بولتی تھی تو بہتے جھرنوں کی موسیقی کانوں میں رس گھولنے لگتی تھی پھیلے ہوئے کھیتوں کی جوانی کی طرح وہ باوقار تھی گمبھیر تھی، وشال تھی۔ اور میں ایک چھوٹا سا پودا تھا، اس لئے اُس سر بلند دیودار کے سائے میں پنپ نہ سکا۔

رس! کہتے ہیں دنیا بہت وسیع ہے وقت بہت جلد بیت جاتا ہے لیکن نہ جانے کیوں میرے لئے دنیا بہت چھوٹی سی ہو گئی ہے۔ رائی کے دانے کے برابر، نہ جانے کیوں میرے لئے وقت اتنا لمبا ہو گیا ہے وہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں میں رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر لوٹ کے جاتا ہوں۔ لیکن صرف خیال ہی خیال میں۔

مجھے پہلی بار وہاں ڈاکٹر بنا کے بھیجا گیا تھا۔ جس دن میں وہاں پہنچا، وہاں جمع کا میلہ لگا ہوا تھا دُور سے مجھے ٹمک بجنے کی آواز آئی، دھم دھیپ، دھم دھیپ، دھم دھیپ!

"یہ کیسی آواز آ رہی ہے مواری لال؟"

میں نے کیونڈر سے پوچھا، جو اڈے پر مجھے لینے آیا تھا۔

"یہ ٹمک بجنے کی آواز آ رہی ہے ڈاکٹر صاحب! یہاں دو دنوں سے میلہ لگا ہوا ہے اگلی دو دن اور چلے گا۔"

نرس ۱

نرس! یہ ٹھمک ٹھمکے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟ ارے! تم ٹھمک نہیں جانتیں؟ تم نے کوئی پہاڑی میلہ نہیں دیکھا ہے کیا؟ اوہ! تم... تم نہیں سمجھو گی۔ بہت دنوں کے بعد یہ آواز سن رہا ہوں۔ جیسے کوئی دل کے دریچے پر دستک دے رہا ہو۔ کون ہو سکتا ہے یہ نرس؟

اب تو مدت ہوئی جب میں نے ان دریچوں کو بند کیا تھا

جانتا ہوں کہ ڈاکٹر نے مجھے زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔ میں بھی کبھی ایسے مریضوں کو زیادہ بولنے سے منع کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی کئی مریض بولتے رہتے تھے۔ بولتے رہتے تھے۔

شش! تم خاموش رہو نرس! اس آواز کو سنو۔ یہ آواز بہت دور سے آرہی ہے۔ ہماچل کے وشال آنچل تلے، ان ہرے بھرے درختوں کے بیچ میں، اُن کل کل کرتی ہوئی ندیوں کے آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں کے دامن کے ساتھ ساتھ لپٹے ہوئے اُس اکیلے گاؤں سے

جایا کرتا تھا۔ آج کل اِس جھیل پر صرف امریکی ٹورسٹ جاتے ہیں ۔ دیسی واسیوں اور کتّوں کا داخلہ بند ہے۔

مارشی حیتا کسے کہتے ہیں ۔ کوئی ماڈرن بچہ اپنے اُستاد سے پوچھ رہا ہے۔

" حیتا، ارے تجھے حیتا کے معنی بس آتے ۔ حیتا اُس طاقت کو کہتے ہیں جس سے ریل کا انجن چلتا ہے، ہوائی جہاز کا پروپیلر گھومتا ہے، راکٹ کا دم کا نپتا ہے چاند کی دھرتی ناپتی ہے۔ دُنیا کا نظام قایم رہتا ہے ۔۔

مگر میرے بچے، حیتا کے یہ معنی دس ہزار برس پہلے کے لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں درج ہیں ۔ بعد میں بڑے بڑے پردادا لوگوں نے کھوج کرکے پتہ چلایا ہے کہ مرجان کی طرح حیتا نام کا بھی کوئی جانور حقیقی بس ہے ۔ کبھی ہوا کرتا تھا ۔ مگر بعد میں اس جانور کی بے پناہ طاقت سے گھبرا کر اِسے بوتل میں بند کردیا گیا تھا اور ہمالہ کی ترائی میں کسی غار میں پھینکا گیا تھا ۔

ہائے یہ دُھواں دھواں سی آنچ ۔ یہ گدلا گدلا سا رنگ ۔ یہ مٹیالی سی آسمان کی ہنڈیا ۔ اُبال کیوں نہیں آتا ۔ میرے خدا ، کہیں تم ایک بار پھر اس دھرتی پر رحم لینے کی تو نہیں سوچ رہے ؟ ایسا غضب مت کرنا ، نہیں تو تمہیں بھی میری طرح اپنے آپ سے نفرت ہو جائے گی ۔

ان انتہا نفرت ۔ اِس آسمان سے نفرت ، اس زمین سے نفرت ، اِس گھٹن سے نفرت ، اِن جیلوں سے نفرت ۔ اور تمہاری قسم یہ نفرت بالکل اصلی ہے ، ملاوٹ سے پاک ، پورے دس کی ۔ کسی دن اِس نفرت سے تنگ آ کر میں کہیں کھول جاؤں تو کیا ہوگا ؟ تمہاری یہ قائم کی ہوئی سرشٹی ، تمہارے تخلیق کئے ہوئے لوگ ۔ خوبصورت دل والے اکیلے لوگ جنہیں تم نے اسے پیار سے بنایا ہے ۔ جنہیں میں نے اتنا پیار کیا ہے ۔ دیکھتے کیا ہو بڑھاؤ ہاتھ اور ہمالہ کی ترائی میں اُس غار سے وہ بوتل نکالو ، جس میں حیتا کو بند کیا گیا تھا ۔ اُٹھاؤ کاگ اس بوتل کا • • •

کونے تک تس گیا ہے۔ کتنی گھٹن ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا نہیں۔ پانی کی ایک بوند نہیں، روٹی کا ایک نوالہ نہیں، کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں۔

سُنا ہے آج بادشاہ سلامت کی تاجپوشی ہے۔ اسکول کے بچے بچیوں میں مٹھائی تقسیم ہوئی ہے ــــ بانکو سیارے کا کہنا ہے کہ اُس نے حوروں سو حلوائی اور سرکاری کرمچاری کی باتیں سُنی ہیں۔ دس کو کہہ رہا تھا آٹھ سو دوں گا ــــ کرمچاری کہہ رہا تھا ہزار لوں گا۔ دہی بتا لوے اور سو کا پھیر۔ چپ رہ بانکو سیارے، تیرے ایک جوان بیٹے نے تو پہلے ہی خودکشی کی ہے ــــ ٹنڈھا کھوسٹ استر برس کا ہو گیا مگر عقل ابھی تک نہیں آئی ــــ یہ سرکاری باتیں بھلا تو کیا جانے ؟

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت روپے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر حسرت سے پکار رہی ہے ــــ

اے تاتی اشاتا ہے۔ اب تو اس نوٹ کی قیمت صرف چالیس اور تین پیسے رہ گئی ہے ــــ کل تک تو ستّو پیسے تھی ــــ

اُف! یہ عورت تو مجھے پاگل کر دے گی۔ جانے کون ہے، کس کی بیوی ہے، چڑیل لگتی ہے۔ ابھی چھ مہینے پہلے تک کتنی شسدر لگتی تھی۔ بال سنوارے، ہونٹ اخروٹ کے چھلکوں سے لال کئے ــــ آنکھوں میں کجرے کی پلکی سی تحریریں ڈالے ــــ جوڑے میں موتیے کا ہار سجائے۔ تب تو یہ بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے شادر مادہی تا تی کو پکارتی تھی۔ اب جانے کیا ہو گیا ہے اسے ــــ بال اُلجھے ہوئے، ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوئیں، آنکھیں لال ــــ تیرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں ــــ جیسے جسم میں ایک بوند لہو بھی باقی نہ رہا ہو۔ بہت محنتی سی، ڈھال سی، پژمردہ سی چال میں آکر بالکنی پر کھڑی ہو جاتی ہے ــــ اور حسرت کی ایک نظر ادھر اُدھر ڈال کر آہ بھرتی ہے۔

یہ عورت ضرور کوئی جادوگرنی ہے ــــ میں یہ کھڑکی ہی بند کر لیتا ہوں۔ ہر رہے کا بالس اور رہ گئے گی بانسری۔ دیوار پر ٹنگا ہوا جھیل کی تصویر والا کلنڈر پھلکتا ہے۔ جب میں پانچ سال کا تھا تو ابے اس کی اُنگلی پکڑ کر میں اس جھیل پر سیر کرنے

سکندر بھی چلا گیا اور ایران کا وہ جیالا محمود بھی چلا گیا، مگر ڈاکٹر دھرم داس دنیا
ابھی تنگ گلی کے ناکے پر اپنی دکان سجائے بیٹھا ہے۔ مورخوں کا یہی کہنا ہے کہ دھرم داس
فسادات سے ایک سال اُدھر تک گلگت میں حکمراں کا شوفاری تھا ۔۔۔ اور فسادات کے
دوران ایک گلگتی عورت سے دل لگی کرنے کے جرم میں برطرف کیا گیا تھا ۔۔۔ اور وہ
بھگوڑے کی طرح وہاں سے چلا آیا تھا۔ آج کل یہ گلی کے ناکے پر اپنی دکان میں بیٹھا تمام لوگوں
سے دل لگی کرتا ہے۔ سابقہ شوفاری دھرم داس درما حال کا ڈاکٹر دھرم داس درما ہے اور
جنتا کی سیوا کر رہا ہے۔ تیرہ تین نسخاں، دو دو دکانیں، ایک موٹر گاڑی ۔۔۔ اور بیات عورتوں
نو بچیاں اور دو مردوں کی بے وقت موت اور آگے چل کر مورخ لکھتے ہیں کہ ۔۔۔۔
جب سو سالہ تقاسد دلوٹا ۔۔۔ مگر جانے ڈاکٹر دھرم داس درما کے بارے میں کب مورخ
لکھیں۔

آف! اُس دکان میں کتنا حبس ہے۔ جیسے ایک ساتھ کئی یم دوت گلا گھونٹ
رہے ہوں۔

بے بس بیماریوں کی دستاں صرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔ دیکھتی رہتی ہے۔
سرکار مائی باپ میرا نام تو شام ناتھ ہے، میں پنڈت مسارام کا ایک معمولی کاندار ہوں۔
قتل شسالے سومیل دُور ریڈٹھا کرا لی میں ہوا تھا، پولیس جونی کی تلاش کر رہی ہے ۔۔۔
میں شہر کان کے لئے سودا سلف لائے آیا ہوں، تو مجھے پکڑ کے یہاں لے آتے ہیں۔ میرے کوئی
جرم نہیں کیا ہے مائی باپ مجھے خواہ مخواہ بازار میں سے پکڑ کے لایا گیا ہے۔

اے بڈھے! چپ رہ۔ بھگوان کے گھر میں کھیپ ڈالتا ہے ۔۔۔ یہاں دیر ہے اندھیر
نہیں ہے ۔۔۔ مگر حضور مائی باپ ۔۔۔ دیکھو قتل ہوا ہے۔ قتل کا مقدمہ بھی پیش ہوا ہے
پھانسی تو کسی نہ کسی کو ملنی ہی چاہئے۔

مگر سرکار مائی باپ میں شام ناتھ ہوں ۔۔۔ میں پنڈت مسارام کا بیوپاری
ہوں ۔۔۔

آف! یہ مٹا لا سا گدلا گدلا سا حال، جو آسمان کے ایک کونے سے دوسرے

سے اس کی آنکھیں ملتی ہوئی کہہ رہی ہے۔

اے تاتی، دیکھا تم نے یہ آگے تو سے جلے کا نام نہیں لیتے۔ آنکھوں کی دوستی کھا جاتے ہیں۔

جانے یہ عورت ہر مہینے کے بعد مالکن سے آدھا دھڑ باہر نکالے تاتی کو کیوں پکارتی ہے۔ جانے اس عورت کا چہرہ صاف کیوں نہیں دکھائی دیتا۔ کسی اوورسیر کی بیوی تو نہیں تھی۔ جس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ ہوتی ہے اور جو ایک شام کو سو روپے کی شراب پیتے اور پلاتے ہیں۔ کسی سیٹھ کی دھرم پتنی بھی نہیں لگتی، جو کھدر پہنا کرتا اور ریشمی ٹوپی پہن کر اپنی ہٹی پر سیمنٹ اور بجری ساتھ سے ہر مزدور سے روپیہ کی جگہ ڈیڑھ لکھ کر کلو کی جگہ آٹھ سو گرام دیتا ہے۔ کسی ٹھیکیدار کی سر بھی نہیں لگتی جو دو لاکھ کا مندر بنوا دیتا ہے اور مورتی کے نیچے دس لاکھ کا سونا چھپا دیتا ہے۔

کسی سول سروس کے افسر کی منافق بھی بس لگتی، جو بیوی کے نام پر دلائتی دواؤں کے تیز چرسے رکھ لیتے، ہم بیراں درموں کو سرکار سے قرضے دلوا دیتا ہے۔

کسی مل مالک کی بیوی بھی نہیں تھی، جو سرکار سے اسٹیل کا کوٹہ حاصل کر کے اسے چور بازار میں فروخت کر دیتا ہے۔

آخر یہ عورت کون ہے؟

آج ہوا اس قدر تیز کیوں ہے؟

ہر چیز اُبل رہی ہے۔ دھوپ دہکتی آگ پر۔ اور چیلیں مردوں پر منڈلا رہی ہیں۔

اسے ایک چیل نے جھپٹا مارا اور پانی کی سطح پر سے ایک چھوٹی سی مچھلی کو اٹھا کر لے گئی۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ جب سومنات کو محمود غزنوی نے بے دردی سے لوٹا تو سب پجاری صرف ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ مندر کے اندر یہ کہا گیا کہ وہ آدمی کی طرح شکست کی طرح پیدا گیا۔

دیکھ رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں۔ بالوں کے ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں بالکریٰ کی خوشبو مچل رہی ہے، ماتھے پر شہاگ کی نشانی ایک لال رنگ کے گول تے پیسے کی طرح دمک رہی ہے۔ اس پیسے کی وقعت کیا ہے۔ معمولی سی ساڑھی تو دو سال کی کفایت شعاری سے حاصل ہوتی ہے۔ جانے ایک اُٹھ گرہ کپڑے کا ملا درحریرے کے لئے کتنے سوا لاکھ کا، کتنی ہزار خوشیوں کا، کتنی لاکھ تمناؤں کا خون کرنا پڑتا ہے۔

یہ کس جلد سارے سوالی ہیں۔ رام کی چلیس دیکھ کراس کا ساتھی مجھ اس سے پوچھ رہا ہے۔ اور رام آکاش کی گدلی گدلی فضاؤں میں ٹھنڈی سی تیخ لستہ مارتی کی وہ لومڈیا تلاش کر رہا ہے۔ مگر آسمان تو چیلوں کی اُڑان سے سسمار ہاہے۔ کالی چیلیں، گوری چیلیں۔ چیلیں جن کے گوداموں میں چاول پڑے ہیں، چیلیں جن کے قصبے میں دالیں ہیں۔ چیلیں جن کے پنجوں میں ملک بھرکی تمام کپاس اُلجھ گئی ہے۔

اس رات بات سے تو بس ماس ہی اچھا تھا۔ سیاسی گفتگو کرنا منع ہے بس کی اندر والی دیوار پر لکھا ہے۔ جانے یہ کنڈکٹر وسل کیوں نہیں دیتا۔

سکم مالو! ایٹم بم بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ایک نہیں ہمیں سوا ایٹم بم ساتھ چاہئیں۔ اس کے لئے چاہے ہم لوگوں کو ایک ایک ٹائم کا کھانا کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ میں کہاں جاؤں، کیا کروں، میں اور میری گھر والی اور ہمارے تین بچے تو پچھلے برس سے صرف ایک ہی ٹائم کھانا کھاتے ہیں۔ گھسیٹا گودی مزدور ایسا ہر کھٹا کھٹا کر سوچ رہا ہے۔

ہاں تو سکم مالو! ہماری تمام سمیاؤں کا صرف ایک ہی حل ہے، اور وہ ہے ایٹم بم۔ میں کہتا ہوں میری آدھی تنخواہ لے جاؤ، مگر مجھے ایٹم بم دے دو۔

مگر سکم مالو پریشان ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے کان میں کہتا ہے۔ یار کہیں سے ایک لوتل گھاسلیٹ کا تو انتظام کرا دو۔

ایٹم بم اور مٹی کا تیل۔ ایک کہاں یہ تو دو دو مسائل ہیں۔

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے ادھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت اپنی ہتھیلیاں

تیل میں پکائی ہے۔"

مجھے یاد آرہا ہے صرف تین سال پہلے، جب اس شہر میں وناسپتی گھی یا بناسپتی داخل ہوا تھا، تو گھی کی مشہوری کے لئے بازار میں وناسپتی کے پکوان بنائے گئے تھے ۔۔ اور لوگوں کو پکوڑے وغیرہ کے چکھائے گئے تھے ۔۔ اور پھر لارڈ ڈلہوزی کی کمپنی کی طرح وناسپتی کمپنی نے شہر کو ایسا غلام بنا دیا۔ اب اس غلام راجے کو ایک بار پھر نیلام پر چڑھایا جا رہا تھا ۔۔ لعنت بھیجو ان بات اصل میں ہنڈیا کی ہو رہی تھی، خود بھی مرچیں آنچ پر پک رہی تھیں۔ جانے اس ہنڈیا میں اماں کیوں نہیں آرہا ہے۔

گرمی بہت تیز ہو گئی ہے۔ دیواروں کو پسینہ آرہا ہے۔

"اے کاکا! ایسی لے کر ایک کلو برف تو لے آ۔ حلق سوکھ رہا ہے پیاس کے مارے۔"

"ایک کلو برف؟ پانچ پیسے ہیں؟ خود ہی جا کے لے آؤ نا تو۔ ہمیں تو بیس پیسے میں ملتی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ ابھی صبح ہی تو میں پانچ پیسے میں ایک کلو لے آیا تھا۔"

"بابو! اس ٹیم دوپہر ہے ۔۔ صبح سے دوپہر تک تو آدمی مسٹر بن جاتا ہے۔"

بابو! بلا طوطی ہے، کاکے کی بات اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آرہی ہے۔ مجھ مجھ کا پھیر ہے۔ یا ہیر پھیر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔۔ اور گرمی ہے کہ الاماں ادھیڑوں کے کو ہاں سوکھ گئے ہیں اور اوپر مٹیالا سا، یرقان کے مریض کے چہرے جیسا آسمان اور آوارہ چیلیں ۔۔ تیز عقابی نظریں شمالی مصالحے برتنوں کو جھر کر کھوج رہی ہیں، ٹٹول رہی ہیں ۔ تلاش کر رہی ہیں۔ کہیں کوئی چڑیا کا بچہ تو نہیں بھٹکتا۔ کہیں کسی انڈے سے کوئی چوزہ تو نہیں باہر آیا ۔۔ کہیں کسی بل سے کوئی چوہا تو نہیں جھانک رہا ۔۔

ہائے! جانے کس جادوگرنے ردگی کو انڈے کے خول میں بند کر کے اسے ابلنے کے لئے آنچ پر رکھ دیا ہے۔

وہ ادھر کوئی دروازہ چرچرایا ۔۔ سیڑھیوں پر سیتا کھڑی لالام کو جاتے ہوئے

"اے تماشائی دیکھا تم نے، دو چھینٹے برسانے اور بس کی۔ یہ دو چھینٹوں کی بارش تو آگ لگا دیتی ہے"۔

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت نے فریاد کی۔

ٹھیک ہی کہا سوبھاگوتی نے۔ واقعی دو چھینٹوں کی بارش آگ لگا دیتی ہے۔ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ دے اور دیوانوں کی طرح سر پر خاک ڈال کر بازاروں اور گلیوں میں سے چیختا ہوا گزر جائے۔ جس زندگی کی قسمت میں سوکھا دکھ یہ دو چھینٹیں ہی لکھی ہوں۔ اس زندگی کی آگ اور جلن اور تپش کتنی شدید ہوگی۔

اب اودم گھٹ رہا ہے میرے معبود! ایک صرف ایک سرد ہوا کا جھونکا ادھر بھیج دے۔ تاکہ یہ آگ اک ذرا قابل برداشت ہو جائے۔

مگر بات آوارہ چیلوں کی ہو رہی تھی۔ گدلی گدلی مٹیالی سی فضا میں اڑتی ہوئی یہ چیلیں آنکھوں میں حرص کی چمک لئے گھومتی رہتی ہیں۔ ایک جھپٹا مارا تو دوماسیتی کا کام پڑ گیا۔

"سیٹھ جی آپ کا ٹرنک کال"۔

"بول رہا ہوں جی۔ ہاں جی ہزار ایک ٹن تو ہوگا ہی۔

اچھا، ابھی کرتا ہوں جی۔ اے ملکے! جھونڈریہ کھاتہ اور گودام میں چلا جا۔ مراری! تم دو ٹرک لے کے بھیج جانا"۔

ادھر ہا کے اور مراری گودام میں پہنچ گئے۔ چیل پھر مٹیالی گدلی فضا میں اڑ گئی۔ اس اڑان میں کتنا اطمینان ہے۔ کتنا لاابالی پن ہے۔ ان پروں میں کتنا غرور ہے۔ تھوڑی تھوڑی موسیقی بھی ہے۔ کتھا کلی نہ سہی، دھما چوکڑی ہی سہی۔

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت نے ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کر آواز دی۔

"اے شانتی! اے شانتی! اب تو دوماسیتی گلی بھی نہیں مل رہا۔ آج سبزی

کئی دنوں سے آسمان کی ہنڈیا پک رہی تھی۔ مٹیالے سے اُگرے گدلے سے رنگ کی۔ دُھواں دُھواں سی آنچ پر۔ اور صبح اچانک اِس میں اُبال آیا۔ سویرے سے ہی چند آوارہ چیلیں بہت اُوپر مٹیالی فضا میں منڈلا رہی تھیں۔ جانے کب کس آوارہ چیل نے چونچ کا ٹھونکا مار کر ڈھکن اُلٹ دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری بھاپ باہر اُمڈ آئی۔ بڑا ہنگامہ ہوا۔ ہاتھیوں کی دھکم پیل تیروں کی گرج۔ عصا کے شعلے لپکے۔ ملبد ہوئے۔ اور پھر چاروں اور جل تھل۔ چند ایک پھوار کی میٹھی تیتے چہرے سے ٹکرائیں۔ ایسے لگا جیسے کسی نے تیز پکے گرم تپے پر پانی کے چھینٹے دئے ہوں ایک تھرتھری سی سارے بدن میں آئی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جانے کس خوبصورت گلی سے آیا اور کمرے میں لٹکے ہوئے جھیل کی تصویر والے کیلنڈر کو گدگدا گیا۔ صرف ایک جھونکا۔ صرف ایک لمحہ۔ اس کے بعد میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہنڈیا پر ڈھکن پھر سے بدستور رکھا ہوا تھا۔ اور ہنڈیا اندر ہی اندر پک رہی تھی۔ دُھواں دُھواں سی آنچ پر۔

لڑکیاں جینز پہنے، بالوں کو چہرے پر بکھراتے قہقہے لگا رہی ہیں۔ لڑکے تنگ موری والی پتلونیں پہنے، اپنی پتلی کمروں کو بل دے رہے ہیں۔

یہ تہذیب ان کو کہاں تک لے جائے گی، اس بات کا انہیں کوئی احساس نہیں۔

یہ محور کتنا تنگ ہے، اس کا بھی ان کو کوئی احساس نہیں۔

اور ایک دن جب اُن کی آنکھ کھلے گی اور یہ ہوش میں آئیں گے، تو انھوں نے کانٹا نگل لیا ہوگا اور کوئی ڈور کو دھیرے دھیرے کھینچ رہا ہوگا۔ ڈرائیور راتم حاتم — یہ میرا آخری سفر تھا۔ میرے لئے دعا کرنا کہ میں اگلے جنم میں ٹراؤٹ مچھلی بن جاؤں۔ •••

ایک تصوّر تو آتما کا بھی ہے۔ اس کو کس پلیٹ میں سجا کر ڈنر کی میز پر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کو کس کانٹے میں پھنسا کر جسم سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ شراب کا جام اور چھچھلی تہذیب انسانی جسم میں جلد سے گہری کیسے جا سکے گی ۔۔۔ کیسے جا سکے گی ۔۔۔ جس لمحے میں نے ساری دنیا کو معاف کر دیا۔ اسی لمحے میری آتما نے آخری سانس لے کر دم توڑ دیا۔ اور میں تباہ حال کے کٹھار سے باہر آ گئی۔ میرا آتما کی ایک عورت، ایسے ہی کھنڈروں کا بوجھ سنبھالے آہستہ آہستہ، رک رک کر قدم رکھتی ہوئی ڈک سم کے اونچے جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی نیچے آ گئی۔ ہر پگڈنڈی پر قدموں کے نشان ٹٹولتی ہوئی، ہر جھاڑی کے پیچھے جھانکتی ہوئی، ہر درخت کے تنے کو سہلاتی ہوئی ۔۔۔ یہ کیسا سفر تھا یہ کیسی تلاش تھی۔ میں جگہ جگہ ڈھونڈتی ہوئی گزر گئی ۔ مری ہوئی آتما کو کہاں دیکھا جا سکتا ہے ۔۔۔ اے خدا!! اے میرے خدا ۔۔۔!!

کہیں کسی نے راستہ نہیں بتایا۔ کہیں کسی نے پتہ نہیں دیا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو بتا نہ سکی۔ میں کیا ڈھونڈھ رہی تھی۔ کیوں ڈھونڈھ رہی تھی ۔۔۔ کہاں ڈھونڈھ رہی تھی۔

آتما کہیں مرتی ہے؟ پھر اس دن میرے اندر کس چیز نے دم توڑ دیا تھا؟

اور بارہ برس کے بعد آج میں پھر ان جنگلوں میں جا رہی ہوں، جہاں میرے اندر کسی چیز نے موت کی ہچکی لی تھی۔ مجھے وہیں جانا چاہیئے تھا اور اپنے آپ میں ڈوب جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جہاں ایک پودا مر جاتا ہے، وہیں پر دوسرے پودے کی کونپل پھوٹتی ہے مگر اتنی بڑی دنیا میں، اتنی بڑی تہذیب میں، اتنی بڑی بھیڑ بھاڑ میں کوئی کیا پا سکتا ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کر کے انجن بند کر دیا ہے یہاں سے ڈک سم ہے۔ اب تو یہاں پر ایک نیا ٹورسٹ ہٹ بھی بن گیا ہے اور سڑک بھی پختہ بن گئی ہے۔ میں گاڑی کے شیشوں سے دیکھ رہی ہوں کہ نئی ٹورسٹ ہٹ کے برآمدے میں چند لڑکے اور لڑکیاں کوئی انگریزی ڈانس کرنے میں محو ہیں۔

میں مجھ سے چھین لیا تھا۔ اب ہر چیز میرے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ رام کمار ایک اچھی نام تھا۔ میرا کوئی ماں نہ تھی، کوئی رشتہ نہ تھا، کوئی برادری نہ تھی، کوئی سہیلی نہ تھی — کوئی زمیں نہ تھی، کوئی آسماں نہ تھا۔ آدمی کبھی کبھی کتنا سخت جان ثابت ہوتا ہے — مرتا ہی نہیں — ممی دوسرے کمرے میں سامان باندھنے میں مصروف تھی، اور میں نے برآمدے سے چھلانگ لگا کر جنگلوں کا راستہ اپنایا تھا۔ ایک آدمی تھا جان محمد جو مجھے نہایت دلداری کے ساتھ اپنے کٹھار میں لے گیا اور شاہ مال کے حوالے کر گیا۔ چار سال تک میں شاہ مال کے ساتھ مکی کے ڈوڈے کھاتی رہی۔ مگر وہ بوجھ نہیں ہٹ سکا، جس نے میری آتما کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا تھا۔ میری آتما نے اس بوجھ کے نیچے کس طرح تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر دھیرے دھیرے ہچکیاں لے لے کر جان دی تھی، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ میری ماں کو بھی نہیں۔

اور ایسے ہی ایک لمحے میں جب میری آتما آخری ہچکیاں لے رہی تھی، میں نے سب کو معاف کر دیا — ممی کو مسٹر میگ کو اپنے آپ کو — جیل اور دیار کے درختوں کو — ڈک سم کی گنڈ ڈنڈیوں — اودھی اودھی گھٹاؤں کو۔ کسی کا کوئی قصور نہ تھا ہر کوئی زیادہ سے زیادہ روشنی اور دھوپ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ یہ جنگل کا قانون ہے ایسا کرنے کے لئے اگر چند بے نام پودے کچلے جائیں تو کوئی غم نہیں اگر چند مرغیوں کے گلے کٹ جائیں تو کوئی پرواہ نہیں۔ اگر کچھ بلبلیں دم توڑ دیں تو کوئی تردد نہیں — کیا ہوا اگر وہ بے نام پودا تمہارے دامن کا سہارا لئے زندہ تھا کیا ہوا اگر وہ مرغی تمہاری ساتھ پر میٹھی گیت گایا کرتی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ بیل تمہارے تنے سے چمٹ کر اپنی زندگی بسر کرتی تھی — کیسی تہذیب ہے یہ جس کا تصور ذہن سے آیا۔ جس کی جڑیں ہوا میں جھول رہی ہیں — یہ کیسی تہذیب ہے، جو ایک ہاتھ میں شراب کا جام اور دوسرے ہاتھ میں تھمائے کر پیدا ہوئی ہے میری ماں کا کوئی قصور نہ تھا۔ مسٹر میگ کا بھی کوئی قصور نہ تھا تصور تو اس مرغی کا تھا، جو ڈنر کی ہر ایک پلیٹ میں سجی سجائی ایک لقمے کی زندگی گزارنا پسند نہ کرتی تھی۔
تصور تو اس ڈرافٹ مچھلی کا تھا، جو جالی لگی ہوئی نہر میں قید نہ ہونا چاہتی تھی۔

ممی نے آنکھیں جھکا لیں اور کمرے سے باہر چلی گئی ۔ میں بے حس و حرکت پڑی رہی ، اس لُٹی
ہوئی بھکارن کی طرح جس کی عمر بھر کی پونجی رات کی تاریکی میں لوٹ لی گئی ہو ۔ اور ایسے میں مجھے
محسوس ہوا کہ کسی انجانی طاقت نے اس جنم جنم کے رشتے کی ڈور کاٹ دی ۔
کتنی گہری اور مضبوط ڈور ہوتی ہے یہ ۔ کڑچ کی آواز آئی اور ایک ماں نے اپنی بیٹی
کو کھو دیا ۔
کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے کپڑوں کا لال رنگ کسی دکھ کو کھینچ لائے گا ۔ اور میں
بقیہ عمر سوگ کا کالا لباس زیب تن کئے پھروں گی ۔

یہ پہاڑی کے اونچے گھنے جنگلوں کے پرے ایک بڑی چراگاہ ہے ۔ یہاں گوجر لوگ
بھیڑ بکریاں اور مویشی لے کر گرمیوں کے مہینے گزارتے ہیں ۔ دنیا اور دنیا والوں سے دور
ان لوگوں کی زندگی قدرت کے بہت قریب ہوتی ہے ۔ دودھ اور مکھن کی بہتات اور
شہد کے چھتّے ۔ کوئی نئی تہذیب کی روشنی نہیں ۔ کوئی انگریزی یا دیسی اسکول نہیں کوئی ہسپتال
یا ڈاکخانہ نہیں ۔ کوئی بینک یا سینما نہیں ۔ صرف چند کٹھار ، الاؤ اور مکئی کے بھٹّے ۔
شاہ مال کا کٹھار اسی جگہ واقع تھا ۔ اور جیسا کہ جان محمد نے ایک دن کہا تھا شاہ مال
کبھی لال رنگ کے کپڑے نہیں پہنتی تھی
جس دن میری دنیا تاریک ہو گئی تھی اور ممی مجھے لے کر سرینگر لے جانے والی تھی ، اسی دن سے
میں اس کٹھار میں شاہ مال کے پاس آ گئی تھی اور شاہ مال نے مجھے پہاڑوں کی کہانیاں سنا سنا کر
اور مکئی کے ڈوڈے کھلا کھلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ میں اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ سکوں ۔ ایک مرا
مرا سا ، گھٹا گھٹا سا چہرہ ، جسے دنیا سے چھپا چھپا کے رکھنا پڑے گا ۔ ان درختوں اور جھاڑیوں
سے چھپا کے رکھا تھا ، جن کی چھاؤں میں بیٹھ کر میرے دل میں ایک کرن اتر آئی تھی ۔ سرینگر جا کر
اب میں کیا کرتی ۔ کون سا سرمایہ لے کر میں اس بھورے بالوں والے ، گہری آنکھوں والے اور دلکش
ہنسی والے رام کمار کے سامنے جاتی ۔ ایک ہی سرمایہ تو ہوتا ہے لڑکی کے پاس اور اس سرمایے کا غرور
اور تمکنت اور شان لے کر وہ سر اٹھا کر چلتی ہے ۔ مگر میرا یہ سرمایہ کالے چوروں نے رات کی تاریکی

میں دب گئی۔ سرد ریلی ہوائیں جو میرے چہرے پر کھیل رہی تھیں، کچھ بوجھل سی لگنے لگیں۔ اور دیار کے جھومروں کی وہ تیز خوشبو جو میری ناک کے آس پاس منڈلا رہی تھی، کچھ رنگ سی بدلنے لگی۔

اچانک دو ہاتھوں نے میرا چہرہ تھام لیا۔ میرے گلے سے ایک تیز چیخ نکل کر جنگل کی تاریکیوں میں بکھر گئی دور کہیں کوئی سہما ہوا سا مرغ چلایا۔ پھر لگا جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ چیخ اس کے گلے میں دب کر رہ گئی۔ اور اچانک ایک لمبا کالا دیو کا درخت میرے اوپر گر آیا اور میں اس کے نیچے دب کر کچل گئی۔

ممی اے۔ ممی تم کہاں ہو؟

جانے ممی کون میری چیخیں نہیں سن رہی تھی۔

ممی مجھے بچاؤ — ممی — مگر مجھے کوئی نہ بچا سکا۔ مجھے کوئی نہ بچا سکا۔

صبح منہ اندھیرے جان محمد لینے کشمارے سے واپس آیا۔

"ممی صاحب ادھر ادھر جنگل میں مری پڑی تھی۔ کسی نے نوچ نوچ کر اس کا گلا کاٹا ہے" مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک ایسے شور کی ایک لکیر سی بنتا ہوا جانے لگا۔ سٹرینگ پر ٹیگر ردار ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مگر میں انہیں کھول نہ سکی۔ کیسے کھولتی۔ باہر جنگل میں آگ لگ گئی تھی سر درخت اور ہر جھاڑی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اور جلے ہوتے اور ادھ جلے پرندوں کی لاشیں دور دور تک بکھری پڑی تھیں۔

"اٹھو بیٹی دیر ہو گئی ہے — آج ہم نے سرینگر جانا ہے" ایک دھیمی سی اداس سی آواز نے پکارا — اور میں نے آنکھیں کھول دیں — سامنے ممی کھڑی تھی۔ ممی؟ نہیں یہ کوئی دوسری عورت تھی جو ایک رات کے وقفے میں بوڑھی ہو گئی تھی۔ بوڑھی اور دیر تک اداس — میں دیر تک اس چہرے کو دیکھتی رہی۔ جس پر رات کی رات میں جھریاں ابھر آئی تھیں میں دیر تک ان آنکھوں کو دیکھتی رہی، جو رات کی رات میں سیاہ حلقوں والے کھوؤں میں اتر گئی تھیں

ڈک سم کا ہر درخت اب مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ وہ اُودھی اُودھی گھٹاؤں کے ہجوم، جو
جھومتے جھامتے ہر شام جنگل کے پیچھے سے نمودار ہوتے تھے، میرے لئے عذاب جان ہو گئے تھے۔

اُس واقعہ کے بعد مسٹر ہیگ کبھی میرے سامنے نہیں آیا۔ آیا ہوتا تو میں اپنی کانونیٹ
کی تعلیم بھول کر، بھوکی شیرنی کی طرح اس کا منہ نوچ لیتی۔۔ ممی اور وہ البتہ ایک ساتھ کھانا
کھاتے رہے۔ ساتھ ساتھ سیر کو جاتے رہے۔ اور ساتھ ساتھ ٹورسٹ ہٹ کے برآمدے میں بیٹھے
شراب پیتے رہے۔ اور مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ ممی مسٹر ہیگ سے ڈرتی ہے
اور ایسے میں مجھے ڈیڈی کا خیال آیا۔ جانے اتنے دن میں ڈیڈی کو کیسے بھول گئی تھی۔ ڈیڈی
کتنے شریف اور آزاد خیال تھے۔ حالانکہ میں نے ان کو ممی کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے کبھی نہیں
دیکھا تھا۔ کبھی دس منٹ سے زیادہ ممی کو اور ان کو اکٹھے ایک جگہ بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں
جانتی تھی کہ وہ ممی کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ انہیں ممی کے کسی دوست پر اعتراض
نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کا اُداس اُداس سا اور کھنچا کھنچا سا رشتہ ان دونوں کے درمیان
تھا جو ایک ساتھ بریک فاسٹ کرنے اور ساتھ بیٹھ کر شام کا کھانا کھانے تک محدود تھا۔
باقی وقت ڈیڈی اپنے دفتر اور اس کے بعد کلب میں گزارتے تھے۔ اور ممی اپنے دوستوں
کی محفلوں میں۔

اُس رات میرا بخار اُترے چار دن ہو گئے تھے۔ میں پھر سے روبصحت ہو گئی تھی اور
سری نگر جانے کے نشے میں سرشار اپنے بستر پر سوئی تھی۔ مدہ جانے کن وادیوں میں ماری ماری
پھر رہی تھی اور میری پلکوں کے پاس نیند سے گریز کر رہی تھی۔ البتہ ایک غنودگی سارے
دن پر چھائی تھی۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور باہر بارش مسلسل گرتی جا رہی تھی۔ درختوں
کے پتوں پر بارش کے قطرے گر کر ایک عجیب طرح کی سحر زدہ موسیقی کو جنم دے رہے تھے
میں اس موسیقی کے دھارے میں بہتی بہتی نہ جانے کن جزیروں تک جا پہنچی تھی مجھے محسوس ہو رہا
تھا جیسے کسی سنسان جزیرے پر میں اور رام کمار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک درخت
کے نیچے لیٹے لیٹے سحر ہو گئے ہیں۔

کہیں سے لکڑی چرچرانے کی آواز آئی۔ مگر یہ آواز اس سحر زدہ موسیقی کے ہلکے سے تیور

"یُو ڈرٹی بچ! تم ہم کو سلیپ کیا؟ ہم تم کو لوکرتا اور تم ہم کو تھپڑ مارتا۔"
مسٹر میگ ہانپ رہا تھا۔ میں نے برآمدے کے جنگلے کو پھاند کر چھلانگ لگائی اور جنگلوں کی طرف بھاگ گئی۔ بھاگتی رہی، بھاگتی رہی حتیٰ کہ میری ٹانگوں نے مزید بھاگنے سے انکار کیا۔ پھر میں ایک جھاڑی میں منہ کے بل گر گئی اور رو رو کر تڑپنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ اس جنگل سے نفرت ہو گئی اور ایسے میں مجھے اپنا آپ بالکل اکیلا نظر آیا۔ اکیلا اور بے یار و مددگار۔ اور اپنی بے بسی پر مجھے رونا آیا۔ میں دیر تک روتی رہی، حتیٰ کہ میرے تمام آنسو ختم ہو گئے۔ اور پھر روتے روتے میں بے ہوش ہو گئی۔
عجیب طرح کی بے ہوشی تھی وہ۔۔۔ ہوش میں آ ہی گئی، گر ابھی تک بے ہوش ہوں۔
کاش اپنی اُس دن ہوش میں نہ آئی ہوتی۔۔۔ اور وہیں جھاڑی کے اندر اُس سنسان جنگل میں، دیودار کے درخت کے نیچے مر گئی ہوتی۔

دیار اور چیل کے درختوں سے گزر کر آتی ہوئی ٹھنڈی زہریلی ہوائیں تپتے ہوئے اور جلتی ہوئی آنکھوں کو کتنی بھلی لگتی ہیں۔ کہتے ہیں یہ ہوائیں تپ دق کے مریضوں کے لئے اکسیر ہوتی ہیں مگر میں تپ دق کی مریض نہیں تھی۔ میرے اندر کہیں ہول سے اُٹھتے تھے۔ رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر۔ لگتا تھا بخار ٹوٹ ٹوٹ کے پھر واپس آتا ہے۔ آٹھ دن یہی کیفیت رہی۔ جس دن مجھے بے ہوشی کی حالت میں جنگل سے لایا گیا تھا، اُس دن ممی مسٹر ہینگ کے ساتھ رات بھر لڑتی جھگڑتی رہی۔ جب میں ہوش میں آگئی تو ممی نے مجھ سے رو رو کر معافی مانگی۔ ممی کو اپنے دوست پر بے حد غصہ تھا، اور اپنے آپ پر بھی۔
"تمہارا بخار اُتر جائے، تو ہم سرینگر واپس جائیں گے۔"
اور آٹھ دس روز کے بعد میرا بخار اُتر گیا۔ میں نے کھینچ کھینچ کے اسے اُتارا۔ لڑ جھگڑ کر اسے اُتارا۔ صرف اس خیال سے کہ بخار اُترنے کے بعد میں سرینگر چلی جاؤں گی۔ [illegible] اور سرینگر کے درمیان کا ساٹھ باسٹھ میل کا راستہ میرے لئے کالے کوسوں کا بن گیا تھا۔

پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اِن لکڑی کے مکانوں میں یہی تو ایک عیب ہے کہ ذرا ہوا اور سے چلنے لگی تو یہ چرچراتے ہیں ___ میں نے مڑکر دیکھا ___ مسٹر ہیگ تھا۔

"ہلو سوئیٹ ہارٹ"

"ہلو انکل"

"تم ہارا کو لفٹ کرتا ہے، ہے نا؟" وہ میرے پیچھے آکے کھڑا ہو گیا۔

"اوہ نو انکل ___ یہ تم سے کس نے کہا"

"تمہارا آئی جوڑتے ___ تم ہارا پاس کبھی نہیں بیٹھتا"

"بس اتنی سی بات؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی خاموشی سے جنگل کو دیکھتی رہی میرے اندر ایک حس مسٹر ہیگ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مسٹر ہیگ ایک ولایتی مِل کی ٹی کا تاج کا محرر تھا۔ آزادی کے بعد بھی انگریزوں کو ہندوستان میں اتنی زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں کہ یہ خرچ کرتے نہیں تھکتے۔ ممی کہتی تھی مسٹر ہیگ کو ساڑھے چار ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے اس کے علاوہ رہنے کے لئے بنگلہ، سواری کے لئے گاڑی اور خدمت کے لئے چار ہندوستانی نوکر۔ ممی نے کہا تھا کہ مسٹر ہیگ نے شادی نہیں کی ہے۔

اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے شانوں سے پکڑ کے اوپر اٹھایا ___ شراب کا ایک بھبکا میری ناک میں گھس آیا ___ میں نے دیکھا مسٹر ہیگ کی آنکھیں سمٹ کر سوئی کی نوک کی طرح ہو گئی تھیں ___ میرے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو گئے ___ اور مجھے اپنے ہونٹوں پر دو جلتے ہوئے انگارے محسوس ہوئے ___ اور پھر یکلخت میری تمام طاقت واپس آگئی میں نے ایک ہی جھٹکے میں اپنا آپ چھڑا لیا اور پھر میرے کانوں نے گولی چلنے کی سی آواز سنی۔

چند لمحوں کے لئے تمام پیڑوں نے دم سادھ لیا۔ اف وہ چند لمحے جیسے ساری زمین رُک گئی ہو، جیسے کائنات کا دل بیٹھ گیا ہو۔

کاش میں نے رام کمار کے اندر پتے کو یسی میں رہ ٹال دیا ہوتا۔۔ اور اس کے ساتھ ہی بارہ بیگر چلی گئی ہوتی۔

صبح ہی صبح جان محمد کی کے بھٹے بھٹوں کے لے آیا۔ میں برآمدے میں بیٹھی جانے کن خیالات میں گم تھی۔ جب سے رام کمار گیا تھا، مجھے تنہائی اور خموشی اچھی لگنے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پہروں کسی سنسان اور خاموش کونے میں بیٹھی بیٹھی آں لوجھے حواب دیکھتی رہوں۔ جانے یہ حوالوں کی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ آدمی کو ایک عجیب طرسا کے نشے میں مدہوش رکھتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو جنت کا تصور حوالوں کا مرہون منت ہے۔

"چھوٹا میم صاحب، یہ بھٹے لے آیا ہوں۔"

"ارے جان محمد! صبح ہی صبح اِن کا کیا کریں گے۔"

"کھائیں گے میم صاحب۔ اصلی جتری کی گئی ہے۔۔ بڑی طاقت ہوتی ہے اِس میں طاقت اور مٹھاس۔"

"میں نے کس تیس سے لڑائی لڑنی ہے، جو طاقت کی ضرورت ہو۔"

"کیسی بات کرتا ہے چھوٹا میم صاحب۔۔ محبوب کا انتظار صرف طاقت والا ہی کر سکتا ہے۔"

"جاؤ، تم اپنا کام کرو۔" میں جھلائی۔ غصہ دلانے والی باتیں کرتا ہے یہ جان محمد بھی کبھی۔ جنگلی گھر کہیں کا۔۔ محبت کی باتیں کرتا ہے، محنوں کی اولاد۔

جانے یہ چڑچڑا پن کہاں سے آ گیا تھا مجھ میں۔ کونوینٹ میں مدر سپیریئر کہا کرتی تھی کہ لڑکیوں کو چڑچڑا نہیں ہونا چاہیے اور غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ خوبصورتی زائل ہو جاتی ہے۔ مسٹر میگ اندر کمرے میں میٹھے شراب پی رہے تھے۔ اور ممی یونی پر میٹھی میر کو گئی تھیں۔ اور میں وہیں برآمدے میں بیٹھی بیٹھی اپنے چڑچڑے پن پر کڑھتی رہی۔ جان محمد شاید ناراض ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا مجھے جانساماں کو جھڑکنا نہیں چاہیے تھا جانے اپنے بھولپن میں کیا کہتا ہے۔

سُن کر مدہوش ہوگئی۔ صرف ایک گیت باقی رہ گیا ایک بول سُنائی دیتا رہا۔ ایک آہنگ کا سحر فضا پر چھایا رہا حتیٰ کہ جان محمد گل اپنی باتیں بھول کر میری باتیں سُننے لگا۔

"چھوٹا میم صاحب اتم پر خدا کا نور اُترآیا ہے"

"وہ کیا ہوتا ہے جان سامان"

"محنت ــ محنت خدا کا نور ہوتا ہے چھوٹا میم صاحب۔ یہ نور ہر آدمی کی قسمت میں نہیں ہوتا"

اور آتشداں کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں اپنی قسمت پر نازاں ہوتی رہی۔ ساری رات بھیگی بھیگی آنکھوں سے وہ خواب دیکھتی رہی، جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک پوری عمر گزاری جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ صبح ہوگئی ــ اس دن رام کمار کو واپس جانا تھا ــ میں اور رام کمار پیدل ہی چل پڑے ــ باقی آدمی گاڑی میں پیچھے آنے والے تھے۔

"پروین امری بات مانو اور میرے ساتھ ہی سرینگر چلو" اُس نے خوابیدہ سی آواز میں کہا۔

"چند ایک دنوں کی تو بات ہے اتنے آتاولے کیوں ہو رہے ہو" میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"جانے کیا بات ہے پروین۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا"

"تھوڑا ڈاولنگ اتم بڑے وہمی ہو" میں نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں باقی لوگ گاڑی میں آگئے ــ اور رام کمار کی آنکھوں میں ایک سوال لئے اُمیر سوار ہوگیا ــ گاڑی روانہ ہوگئی اور میں موٹر پر رُک کر اُسے دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ گاڑی دھول کی تہہ میں چھپ گئی اور میں اُس غبار کو دیکھتی رہی ــ دیکھتی رہی ــ دُور کہیں سے کسی نے آواز دی ــ اور مجھے یاد آیا ــ کالی داس کا وہ سپن جب دتییت جنگل سے واپس چلا آتا ہے اور شکنتلا ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے ــــ دیکھتی رہتی ہے۔

ــــ شاید کہیں کسی موٹر پر کوئی اور انگوٹھی کھو جانے والی تھی

"جی۔ جی ہاں"

"میں رام کمار ہوں ۔۔ وہ لوگ شراب پی رہے ہیں۔ اور میں جھک مارتے مارتے یہاں آگیا"

"شراب پیتے۔ جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی"

"اوہ یہ تو ایک کہانی ہے مس۔ گھر میں ممی پیتی ہیں، ڈیڈی پیتے ہیں کوئی تو ہونا چاہیئے جو گرنے کو سنبھال سکے۔ اگر وہ لوگ ڈرائنگ روم میں پیتے پیتے بے ہوش ہو جائیں تو اُن کو بیڈروم تک تو لانا ہوتا ہے ۔۔ اور پھر ڈیڈی نے کہہ دیا ہے کہ مجھے چالیس سال کی عمر کے بعد شراب پینے کی اجازت مل جائے گی"

"ابھی اور کتنا انتظار ہے"

"انتظار ہی انتظار ہے۔ ڈیڈی کے حساب سے پندرہ سال ہیں اور میرے حساب سے سوا سو سال"

رام کمار کی باتوں میں کوئی طنز نہیں تھا۔ کوئی بیادرٹ نہیں تھی۔ اس نے تو ایک حقیقت کو بیان کیا تھا۔ بھولے بھالے انداز میں۔ اور مجھے رام کمار ایک دم اچھا لگا۔ جانے کیوں اچھا لگا۔ اور پھر میری لوریت ختم ہو گئی۔ رام کمار تیرہ دن وہاں رہا اور وہ تیرہ دن ہی دراصل میری تمام عمر ہے۔ باقی کے سال اُن تیرہ دنوں کا سُود در سُود ادا کرنے میں گزر گئے۔

ان ہی تیرہ دنوں میں ایک دن وہ بھی تھا، جب میرے کانوں نے پیار کا راگ سنا۔ ایک دن وہ بھی تھا جب میرے دل میں رکھے ہوتے گملے میں ایک خود رو پھول کھل اُٹھا۔ ایک دن وہ بھی تھا جب مدھم چاند کی روشنی میں جھیل کے درخت کے تنے سے لگ کے میں نے اپنی ساڑھی کا پلو اپنی انگلی کے گرد لپیٹتے لپیٹتے کسی کے ساتھ اقرارِ وفا کیا تھا۔۔ ایک پوری زندگی کی داستاں ان تیرہ دنوں میں سما گئی۔ ایک اَن کہی روپہلی تصویر ان تیرہ دنوں میں سانچے میں ڈھل گئی۔ ڈک سُم کے جنگل پیار اگ بھول گئے، اور میلراگ سنتے سنتے سو گئے۔ وہ کل کل کرتی ہوئی ندی اپنی موسیقی بھول بیٹھی اور میرے تنفس کی موسیقی

ستمبر کا مہینہ بڑا ہی البیلا مہینہ ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کی تمنائیں دل میں گدگدانے
لگتی ہیں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ خوب قہقہے لگائے اور چیل کے درخت کے نیچے کرسی ڈالے
گھنٹوں بیٹھا رہے اور قدرت کا راگ سنتا رہے۔ یہ راگ کوئی موسیقار ترتیب نہیں دیتا
ایک لے کہیں سے ابھرتی ہے اور گھوم کر ارد گرد کی پہاڑیوں میں ایک لمحہ ٹھہری وہاں گم
ہو جاتی ہے۔ پھر ایک سارسہ مجھے لگتا ہے۔ یہ جنگل کا راگ ہے۔

ڈلکم کے سنسان ٹورسٹ ہٹ میں یہ راگ سنتے سنتے میں مدہوش ہو گئی۔ ممی اور
مسٹر ہیگ دن بھر جنگلوں کی خاک چھانتے نکل جاتے تھے۔ جنگلوں سے مجھے ڈر لگتا تھا اور
میں اکیلی اس سنسان ہٹ میں بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی۔ ایک جان محمد تھا جسے باتیں کرنے کا
اتنا شوق تھا کہ اس شوق میں وہ مجھے کھانا کھلانا بھی بھول جاتا تھا۔ بڑا سیدھا سا آدمی تھا
یہ جان محمد بھی۔

بارشیں دور ہوتی تھیں اور ایسے میں جی چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے۔ مگر کیا ہو جائے،
اس کی تصویر میرے سامنے کوئی نہ تھی۔ ایسا ہی ایک بارش کا دن تھا، جب وہ شکاریوں کی
پارٹی ڈلکم آ گئی، جس میں وہ بھورے بالوں والا، گہری آنکھوں والا اور دلکش ہنسی والا
رام کمار بھی تھا۔

رام کمار کو شکار سے دلچسپی تو نہ تھی، مگر اس کے ڈیڈی نے اسے اس پارٹی کے ساتھ شامل
کر دیا تھا۔ دل بہلانے کے لئے شاید۔ شام کو ممی، مسٹر ہیگ اور اس شکاری پارٹی کے
پانچ آدمی آتشدان کے ارد گرد بیٹھے شراب پینے لگے۔ شراب مجھے بہت ڈراتی ہے۔ ایک
عجیب قسم کا تصور ہے شراب اور شراب پینے والوں کے بارے میں۔ میں دوسرے کمرے
میں اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی کہ رام کمار میرے کمرے میں آ گیا۔ تین ہی تو کمرے تھے اس
ٹورسٹ ہٹ کے۔

"آپ مس پرمیلا ہیں ہے نا؟" اس نے کمرے میں آ کر پوچھا۔

میں کونوینٹ اور پھر کالج کی پڑھائی ختم کر کے ممی کے ساتھ ڈک سم چلی آئی تھی۔
تب ڈک سم میں صرف وہ پرانا ٹورسٹ ہٹ تھا اور ارد گرد گھنے جنگلوں اور جنگلی پھولوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دُور دُور تک کسی بستی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ایک ندی البتہ کھردرے انداز میں پتھروں پر سے پھیلتی ہوئی بہتی تھی ـــ اور جہاں جنگل نہیں تھا، وہاں دُور دُور تک مکئی کے کھیت تھے۔
ممی اور میں جب گاڑی سے اترے تو سامنے ٹورسٹ ہٹ کے برآمدے میں مسٹر بیگ ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے ہمارے استقبال کو کھڑا تھا مسٹر بیگ ممی کا قریبی دوست تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ایک عجیب انداز میں سیٹی بجائی۔
"ہلو ینگ لیڈی" اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔
اُسی شام آتشدان کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے خانساماں جان محمد نے بتایا کہ مسٹر بیگ نے دن میں اُس ریچھ کو گولی ماری تھی، جس نے مکئی کے کھیت سے ایک گھر عورت کو اٹھا لیا
ـــ مجھے ہنسی آ گئی۔
"تم کیوں ہنستا ہے چھوٹا میم صاحب! یہ ریچھ لوگ بڑا ظالم ہوتا ہے ـــ عورت کو بھگا لے جاتا ہے۔"
"یو آر انڈیٹ" میں زیر لب بڑبڑائی ـــ
"اور کیا میم صاحب؟ اُس عورت کو تو ضرور لے جاتا ہے، جس نے لال کپڑے پہنے ہوں ـــ لال کپڑے کا عاشق ہوتا ہے۔"
"سلی" میں نے ناک بھوں چڑھائی۔
"ہاں چھوٹا میم صاحب! اس کبھی ایسی عورت شاہ مال کو لال کپڑا نہیں پہننے دیتا۔
میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے سوچا کتنے جاہل اور وہمی ہوتے ہیں یہ لوگ۔
مگر میرا وہ قہقہہ شاید میرے اوپر طنز کر رہا تھا۔ کاش! میں نے جان محمد کی بات کو ہنسی میں نہ ٹال دیا ہوتا ـــ اور اپنے تمام لال رنگ کے کپڑے جلا دیئے ہوتے۔

لٹتا رہا ہو گا۔

کوئی چیز نہیں بدلے گی، صرف آدمی بدل جائے گا۔ اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ جائے گی، اس کے بالوں میں چاندی کے تار گھل مل جائیں گے ___ اور وہ چند گزرے ہوئے لمحوں کو مچھلی پکڑنے کے لئے دریا کی کھول مچھلیوں میں کھویا کھویا پھرے گا۔ بغیر آسرے کے، بغیر کسی امید کے، بغیر کسی مستقبل کے۔

انگلینڈ کا ماحول اور یہاں کی خوشی کتنی اچھی ہے۔ مگر یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ اُن ٹراؤٹ مچھلیوں کا دم بھی گھٹتا ہو گا جو جالوں والی نہروں میں مقید کسی ولایتی یا دیسی صاحب کے کانٹے میں پھنس کر تڑپنے کا انتظار کرتی ہیں۔

بے وقوف مچھلیاں!

اگر میں مرنے کے بعد ٹراؤٹ مچھلی بن جاؤں؟

آپ ایسے عجیب عجیب سے حالات دماغ میں گھس آتے ہیں۔ صبح سے یہی حال ہے۔ لگتا ہے جیسے میں واقعی مرگئی ہوں اور ایک ٹراؤٹ مچھلی بن کر اس جالی لگی ہوئی نہر میں بند ہو گئی ہوں۔ اور ابھی کوئی ولایتی یا دیسی صاحب آکر اپنا کانٹا پانی میں پھینکے گا ___ اور پھر یہ کانٹا میرے حلق میں پھنس جائے گا ___

کس قدر رحاں لو امسطرہے۔

ڈرک قسم کی خاموش تنہائی کی طرح۔

ان تنہائیوں کو میں نے آج سے بارہ برس پہلے ایک چیز سونپی تھی ___ اور آج میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اس چیز کو حاصل کرنے جا رہی ہوں۔ ڈر رہی ہوں اگر ان تنہائیوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تو ___؟

بارہ برس کافی لمبا عرصہ ہوتا ہے ___ اور بارہ برسوں میں آدمی کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ تب تو ممی کا سہارا تھا، اپنی نوعمری کا سہارا تھا اور اپنی انا کا سہارا تھا۔ آج کچھ بھی تو نہیں ہے بجز چند ٹیڑھی میڑھی اور تلخ یادوں کا جو رہ رہا ہے، جسے دل لٹانا چاہتا ہے مگر جسے لوٹنے والا کوئی نہیں ___ کوئی نہیں۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی ہے۔ حالانکہ گلمرگ سے ڈک تک جاتے جاتے گاڑی کی رفتار کم کر دی جانی چاہیے، نہیں تو اُن سر بلند دیار اور چیل کے درختوں کا لاابالی پن، جگہ جگہ اُگے ہوئے جنگلی پھولوں کی رنگا رنگی، قدم قدم پر بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی مست خرامی دیکھنے میں نہیں آئے گی ــــ اور آدمی یہ کبھی نہ جان سکے گا کہ اُس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کچھ لوگ یہاں پکنکوں کے لیے آئے ہوتے ہیں۔ یہ صرف سڑک کا کھردرا پن اور اسپیڈ میٹر کی سوئی ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی نظر آدمی کی روح کو کبھی نہیں ڈھونڈتی۔

ہائے یہ نظر کی بے نظری!

گلمرگ میں ڈیلیا کے جنگلی پھول بدستور خوبصورت ہیں اور جھرنے کا پانی بدستور مدھر دور تیزی سے چٹانوں کا سینہ چیر کے باہر آ رہا ہے۔ بارہ سال پہلے جب میں یہاں آئی تھی، یہ تب بھی ایسے ہی تھا۔ چالیس سال پہلے جب کہ میں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی، اس کے رنگ ڈھنگ ایسے ہی تھے اور سو سال کے بعد جب میری بھٹکی ہوئی روح بھی اس دنیا کا طواف کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہو گی، یہ ڈیلیا کے پھول اسی طرح مسکرا رہے ہوں گے اور یہ جھرنا اسی طرح فراخ دلی سے اسی بہار

ارے وہ دیکھو۔ اس چٹان کے پاس سیپیوں کے ڈھیر کے ساتھ ایک اور وہیل کسی نے دور سے آواز دی جیسے ہی چپ چپ رک گئی کشتی تنا مد بھر گئی اور اچانک چند ہاتھ مجھے ٹٹولنے لگے یہ یہ دیکھو آنکھوں کے نشاں۔ کسی اور نے کہا میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ آنکھیں کھل نہ سکیں میں نے چلا کر پوچھا کیا کہیں کوئی چراغ جل رہا ہے۔ پر کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

اٹھا کر ڈال دو کشتی میں۔ کوئی اور پکارا۔۔ میں نے چلا کر پھر پوچھا۔ کیا طوفاں ختم ہو چکا ہے؟ اس بار بھی کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ پھر کچھ ہاتھوں نے مجھے اٹھایا اور ایک تختے پر ڈال دیا۔ کیا کشتی کے عرشے پر؟ اس کے بعد میں سو گیا

ابھی ابھی میں نے چوری چھپے ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں بدستور ننگ دھڑنگ پڑا ہوں۔ ایک شیشے کے صندوق میں۔ باہر روشنی لگی ہے۔ لوگوں کی آوازیں بھی ہیں دور کہیں کوئی نغمہ بج رہا ہے۔ یہ کون سا مقام ہے؟ اجنبی سا لگ رہا ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا چاہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کسی عجائب گھر میں، شیشے کے صندوق میں بند ہوں۔ اس صندوق کے اوپر تختی پر کچھ عبارت لکھی ہے، جسے میں پڑھ نہیں سکتا۔

کیا کوئی خدا کا بندہ مجھے یہ عبارت پڑھ کر سنائے گا؟

***

جاگیر جب تمام لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ یہ کلائی کی گھڑی میرا ساتھ نبھاتی رہی۔
میں تمام کو اسے جابی دیتا۔ اور یہ دن رات مجھے پل پل اور لمحے لمحے کا احساس دلاتی۔ بتاتی چلی جاتی کہ لمحے گذر رہے ہیں دن گزر رہے ہیں سال گزر رہے ہیں عمریں گزر رہی ہیں۔ اب اٹھارہ سال کے بعد یہ کم بخت بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔۔۔ بھاگتے بھاگتے مجھے احساس ہوا کہ میں دوبے ہلکا سا ہو گیا ہوں بلکہ بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ کیا اس بھی سی جان کا وزن آتا تھا۔ ؟ صدیوں کا وزن جیسے میرے شانوں سے اتر گیا تھا۔
اچانک طوفانی ہوا کا ایک ریلا آیا اور مجھے اٹھا کر لے گیا میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا بے بس سا، محصور سا ہوا کے اسی بیچ میں سدھ تھی کوئی شخص چلایا کہتا تھا میں نے، تب گندم اور چاول موتیوں کے بھاؤ بکیں گے۔ کہتا تھا میں نے، تب مائیں اپنی بیٹیوں کے ہاتھ تھام کر بازار کا رخ کریں گی۔
کہا تھا میں نے، تب سورج سمت بدل ڈھلکا جائے گا اور ایک لمبی کالی بھیانک رات زمین کو نگل لے گی۔
مجھے غصہ آیا۔ جانے کیوں چلا رہا ہے یہ شخص کہتا تھا تو کہا ہوگا۔ اب خاموش رہ کر طوفان کا نظارہ کیوں نہیں کرتا یہاں کوست سے اتحام بہت ساری باتیں کہہ گئے تو پھر؟ نکلا آدمی غلامی کے خول سے باہر؟ ہوا اجالا لوگوں کے تاریک محلوں میں، کھلا کوئی گلاب کسی ویران دل کے اندر، جلا کوئی دیا کسی نیم تاریک طاق میں؟
یک دم جیسے ہواؤں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میں زور سے ایک چٹان کے اوپر گر کر پاش پاش ہو گیا اُدھر اسی دستور قائم رہا طوفان بدستور گرفتار، مجھے بیت گئے جانے کتنے لمحے کتنے ماہ و سال کتنی صدیاں مجھے کوئی ہوش نہیں۔ کوئی شمار نہیں کوئی دھیان نہیں لہریں آتی رہیں ۔۔۔ ٹکراتی رہیں ۔۔۔ سا کا ایک انبار میرے آس پاس جمع ہوتا
کتنی کے ٹیلے کی آواز چپکا چپ چپ۔

ہائے ایسی ایک تتلی تھی جو پچھلے اٹھارہ سال سے دن رات میرے ساتھ رہی ہے۔ تب بھی
جب بچپن کے دوست نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ مِل کا مخبر بن گیا تھا، اور میں مِل کے مالک
کے ماہر کتابیں اور کاریاں بیچنے کا دھندہ کرتا تھا مِل کے ماہر دھندہ کرنے والوں پر یہ فرض عائد
ہوتا ہے کہ وہ منیجر صاحب کو آتے جاتے سلام کریں میں دوستی کے بھرم میں رہا اور سلام نہیں کیا
بچپن کے دوست نے کہا احسان فراموش ہے۔

تب بھی جب میری محبوبہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ گلیمر آرٹس نامی دکان میں
ملازم ہو گئی تھی، جہاں اُسے صرف کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ کر مسکراتے رہنے کا کام ملا تھا اور میں گلیمر آرٹس
نامی دکان کے سامنے موڑ پر نقلیں بیچنے کا دھندہ کرتا تھا اور ہر شام اپنی محبوبہ کو دکان کے
مالک کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھتا تھا محبوبہ نے کہا جاسوس ہے۔

تب بھی جب میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا کیونکہ وہ محض میری تنخواہ سے
مطمئن نہیں تھا۔ بلکہ اوپری آمدنی کا طالب تھا۔ اس کے نزدیک تحصیل کا محرّر خالی خولی تنخواہ
کا نام نہیں ہے۔ تحصیل کے محرّر کے کچھ اور بھی دام ہیں۔ باپ نے کہا اولاد ناخلف ہے۔

تب بھی جب میرے افسر نے مجھے چھوڑ دیا۔ کیونکہ ماتحت کا فرض ہے کہ وہ افسر کے
گھر سبزی چھوڑ آتے، اس کی بیوی کے پاؤں دباتے اور اس کے بچوں کو اسکول چھوڑ آتے۔
افسر نے کہا فرض ناآشنا ہے۔

تب بھی جب میرے وارڈ کے میونسپل کونسلر نے مجھے چھوڑ دیا کیونکہ میں نے الیکشن کے
دوران اس کے لئے پوسٹر لگاتے اور دام مانگے۔ میونسپل کونسلر نے کہا دل بدلو ہے۔

تب بھی جب میرے علاقے کے ودھایک نے مجھے چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اپنے اخبار میں
اس کے حرم کی ایک رنگین شام کی تفصیل چھاپ دی ودھایک نے کہا میرے حریف سے
ملا ہوا ہے۔

تب بھی جب ملک کے حکمراں نے مجھے چھوڑ دیا کیونکہ حکمراں سو رہا تھا، اور میں
جاگ رہا تھا۔ اور اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تاریخ پڑھو جو حکمراں
کی سب سے بڑی رہنما ہے۔ حکمراں نے کہا باغی ہے گرفتار کرو۔

پھر کسی کلرے ایسے ڈرائیور سے کہا۔ استاد جی ا رٹری ڈوں ہو گئی ہے۔ اور تمام ڈرائیوروں نے دیکھا کہ واقعی تمام بیٹریاں ڈوں ہو گئی ہیں۔ ڈیش بورڈ کی تمام روشنیاں گل ہو گئی ہیں اور اچانک تمام لوگوں کو احساس ہوا کہ روشنیاں تو تمام کی تمام سد ہو گئی ہیں نہ بجلی کی روشنی ہے، نہ بیٹری کی روشنی ہے۔ نہ ایمرجنسی لائٹیں ہیں۔ نہ ڈیمو کی روشنی ہے اور۔ اور نہ جگنو کی روشنی ہی نظر آتی ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا ہے عین اسی وقت کسی نے چیخ کر کہا۔ دیکھو ستارے بھی ایک ایک کرکے غائب ہو رہے ہیں اور تمام لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھا واقعی ا ایبرینایک ہواؤں کے جھکڑ زور پکڑنے لگے۔ طوفان گرجنے لگا اور چیخ و پکار بلند ہو گئی۔ اس قدر بھیانک طوفان کہ ہر شے تحس نحس ہونے لگی۔ آسانی شور بلند ہونے لگا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور دیکھایک لوگ بھاگنے لگے۔

ایک کار میرے اوپر سے اڑتی ہوئی آئی اور سامنے ایک دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ میں بھی بھاگ کھڑا ہوا لوگ میرے سر کے اوپر سے اڑتے ہوئے جا رہے تھے، اور کچھ دور جا کر کسی مکان سے ٹکرا جاتے تھے یا کسی درخت کی ٹہنیوں میں الجھ جاتے تھے یا کسی بجلی کے کھمبے سے لٹک جاتے تھے۔ طوفان کے زور سے میرے کپڑے تار تار ہو گئے میرا ایک جوتا جانے کہاں رہ گیا میرے کوٹ کی آستیں میرے بازو میں سے نکل کر نہ جانے کہاں گم ہو گئی میں بدستور بھاگتا رہا سبھی لوگ بھاگ رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہے۔ لوگ بھول چکے ہیں کہ ان کے ہمراہ ان کی بیوی بھی تھی انہیں یاد ہی نہیں کہ ان کی انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی چل رہا تھا انہیں اس کا ہوش ہی نہیں کہ جب وہ گھر سے چلے تھے تو ان کے ساتھ ان کی ماں بھی تھی انہیں یاد ہی نہیں کہ وہ اپنے لاعرباپ کو ڈاکٹر کو دکھانے ساتھ لائے تھے۔

ایک دم ہی جیسے انسانی ذہن نے پلٹا کھایا اور وہ سوائے اپنے سب کو بھول گیا بھاگتے بھاگتے مجھے احساس ہوا کہ اب میرے بدن پر کوئی کپڑا باقی نہیں رہ گیا ہے حتیٰ کہ کلائی کی گھڑی بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔

بند کرتا ہے۔ ہوائی جہاز کا انجن کام کرنا بند کرتا ہے۔ لوہے کا کارخانہ کام کرنا بند کرتا ہے۔ ریل کا انجن کام کرنا بند کرتا ہے۔ سنیما کا پروجیکٹر کام کرنا بند کرتا ہے۔ دفتر کا کلرک کام کرنا بند کرتا ہے
مگر دفتر کا کلرک آدمی ہوتا ہے، اس بات کے باوجود کہ کچھ لوگ اسے مشینری کا پُرزہ سمجھتے ہیں۔
اس کو جانے دیجیے کہ یہاں تو صرف مشینوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے سمجھا کہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں ہو رہی ہے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کیونکہ لوگ ان باتوں کے عادی ہو گئے ہیں۔

جیسے میں بارہ دن نلکے میں پانی نہیں آتا، لیکن بس پورے مہینے کی لگتی ہے بجلی مہینے میں دس دن بند رہتی ہے مگر بس پورے تیس دن کی لگتی ہے۔ سیمنٹ کی بوری کا وزن سات کلوگرام کم ہوتا ہے، گودام پچاس کلوگرام کے لئے جاتے ہیں آٹے کی بوری میں چار کلوگرام ریت ملتا ہے۔ گودام ــــ ٹرین سات گھنٹے لیٹ اسٹیشن پہنچتی ہے، لیکن ٹکٹ کے دام پورے ہوتے ہیں چنانچہ لوگ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے اور بس اسٹاپوں پر انتظار کر رہے تھے۔ ریلوے پلیٹ فارموں پر انتظار کر رہے تھے۔ راشن کی دکانوں پر انتظار کر رہے تھے۔ میونسپلٹی کے نلوں کے پاس انتظار کر رہے تھے۔ عدالت کے ایوان کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے سرسبز لانوں میں انتظار کر رہے تھے کہ انتظار ضروری تھا۔ اور زندگی کا ایک حصّہ بن چکا تھا اور حسبِ معمول تھا۔

ہواؤں کے جھکڑ بدستور چلتے رہے پھر آسمان پر بادل چھا گئے۔ کالے مہیب بادل۔ آن کی آن میں بارش شروع ہو گئی اس قدر شدید بارش کہ نہ کبھی پہلے ہوئی تھی، نہ کبھی آئندہ ہونے کی اُمید تھی لوگ بدستور انتظار کر رہے تھے۔

پھر اچانک ایک بچے نے کسی قطار میں کھڑے اپنے باپ سے پوچھا۔ ابا آج تو جگنو بھی نظر نہیں آتے اور لوگوں نے دیکھا واقعی کوئی جگنو کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ پھر کسی کارندے نے اپنے مالک سے کہا۔ لالہ جی!

۔ ۔ ۔ اور مالکوں نے دیکھا کہ واقعی دکانوں کے اندر تمام ایمرجنسی لائٹس بند ہو گئی ہیں۔

سرِ شام ہی ہواؤں کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ ایک عجیب طرح کا ملگجا سا
اندھیرا چھا گیا۔ پھر یکایک شہر کی تمام روشنیاں ایک ساتھ بجھ گئیں۔ چند بڑی بڑی
دکانوں میں ایمرجنسی روشنیاں چمک اٹھیں۔ لوگوں نے سمجھا سب کچھ معمول کے مطابق
ہو رہا ہے۔ لوگ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے کیونکہ شہر کی روشنیاں بارہا بجھ جایا
کرتی ہیں ہواؤں کے جھکڑ بھی چلا ہی کرتے ہیں۔ نلکوں میں پانی بھی خشک ہو جایا ہی
کرتا ہے۔

بس اسٹینڈوں پر لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئیں پر کوئی بس نہ کہیں
سے آ رہی ہے اور نہ کہیں جا رہی ہے۔ لوگوں نے سمجھا کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے
لوگ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ بسیں سالہا سال سے اسی طرح لوگوں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیلتی ہی رہتی ہیں پھر کسی نے دیکھا کہ بسوں کی لائٹیں بالکل نہیں جل رہی ہیں
اور شاید اسی وجہ سے بسیں چلنا بند ہو گئی ہیں۔ یہ بھی کوئی خلافِ توقع بات نہیں تھی یہ تو
شہر کی زندگی کا معمول ہے۔ اکثر چیزیں کام کرنا بند کر دیا ہی کرتی ہیں۔ بجلی کا ٹرانسفارمر کام کرنا

میں بالکل اچھی ہوں گی ۔۔۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

کارڈ کے پیچھے لکھے ہوئے حروف دھیرے دھیرے برف سے ڈھکتے جا رہے ہیں۔۔۔ ڈھکتے جا رہے ہیں ۔۔ ابھی یہ حروف دھیرے دھیرے بالکل ڈھک جائیں گے۔ مجھے جلدی گھر جانا چاہیے۔۔۔ آتش دان کے کوئلے تو بجھ گئے ہوں گے ۔۔۔ اور دسمبر اگلی میرا انتظار کر رہی ہو گی **

انسان کے اندر تو ایک پوری کائنات بسی ہوتی ہے ــ تمہاری چیر باہر کہیں نہیں ملے گی دیکھو باہر درختوں کے پتے گر گئے ہیں۔ جانے والے اور سوکھے پتوں کے الاؤ جل رہے ہیں کل کالج سردیوں کے لیے بند ہونے والا ہے ــ پھر برف گرے گی۔ اور ایک سفید چادر سے تمام نشیب و فراز ڈھک جائیں گے ــ پھر تو تلاش محال ہو جائے گی ــ کوئی کھوئی ہوئی چیز واپس نہیں ملے گی ــ حتیٰ کہ نقش پا بھی ڈھک جائیں گے ــ

آتشداں کے کوئلے تو اب راکھ بن چکے ہوں گے۔ وسندرا کا مکاں آ گیا ہے۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑی ہو گئی ہے ـــــ میں اس کی آنکھوں میں اب بھی نہیں دیکھوں گا۔

"راتی ــ !"

"ہوں"

"کیا سوچ رہے ہو"

"سوچتا ہوں اب واپسی اکیلے ہو گی"

"تب تم جاؤ۔ رانی کہیں وہ اکیلی ڈر نہ جائے"

"کون ــ ؟"

"وہی ! میں اُسے آتشداں کے پاس صوفے میں بٹھا کر آئی ہوں۔"

میں تذبذب سے چاہ رہا ہوں کہ وسندرا کو آخری بار دیکھوں ـــ مگر جانے میں ایسا کیوں نہیں کر سکوں گا ـــ وسندرا نے اندر جا کر دروازہ بند کر دیا ہے۔ اندھیرا کیوں گہرا نہیں ہوتا ـــ یہ برف کا اُجالا ـــ سرد اور بے جان، ــ بے آواز ــ

اچانک مجھے اس لفافہ کا خیال آیا ہے۔ جو میری اندرونی جیب میں پڑا پڑا سُلگ رہا ہے ــ یہ وسندرا کی شادی کا دعوت نامہ ہے ـــــ وسندرا اور میجر دت۔

رانی! میرے ساتھ شادی کر کے صرف وہ شخص خوش رہ سکتا ہے، جس کے لئے

'ہاں وسندرا میں ہار گیا ہوں ۔"
دوسرے دن وہ کالج آئی تو اُس نے اعلان کر دیا کہ آج وہ کوئی کلاس نہیں لیگی
میں پہلے پیریڈ کے بعد اسٹاف روم میں داخل ہوا تو وہ سوچوں میں غرق تھی۔ کچھ تھکی تھکی
سی نظر آ رہی تھی۔
"کیا بات ہے وسندرا ؟'
میری آواز سُن کر وہ چونکی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی
"میں سوچ رہی تھی راں۔ کبھی یہ سوچنا بھی ایک باقاعدہ عمل ہے۔ ہے نا ؟"
کیا سوچ رہی تھیں ؟'
"بہت کچھ سوچ رہی تھی میں۔ رات بھر سوچتی رہی ہوں۔ تم چائے منگواؤ گے
تو ایک کپ مجھے بھی منگا دینا۔"
"کیا سوچ رہی ہو وسندرا ؟'
"اوہو استاد ہوں گی۔ تم چائے تو منگوا دو۔ میں دراصل دو باتوں کے بارے
میں سوچ رہی تھی۔ ماضی کی تاریخ اور پیار کا وجود۔
"ہاں راں اپیار کا وجود، یہ دونوں حقیقتیں بھی ایک ہی ماضی کی تاریخ بھی اور پیار کا وجود بھی
"اچھا، تب تو مبارک ہو۔"
"چائے تو منگوا دو۔ تم ایسے مبارکباد دے رہے ہو جیسے تمہیں معلوم ہے کہ۔"
یکایک اُس نے جملہ ادھورا چھوڑا، اور ایک ہی جست میں کمرے سے باہر
بھاگ گئی۔
ست در بھاگ گئی وہ۔ اپنے اندر ہی کہیں ڈوب گئی۔ ایسا جملہ تو مکمل کرو
وستی۔ میری کسی بے بسی۔ میں تلاش ہی کرتا رہا۔ اب اسٹاف روم میں خود وسندرا
آئی تھی، وہ گم سُم سی، عجیب جاپ سی کوئی لڑکی تھی۔ جیسے اس لڑکی کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔
اور نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہ آتی ہو۔ اپنے اندر تلاش کر رہ وسندرا

وہ مجھ سے ڈرتی رہی میں اُس سے ڈرتا رہا۔ اور ڈرتے جھجکتے ہم نے اپنی زندگیوں کو اتنا سمیٹ لیا کہ زیبا کالج کے اسٹاف روم تک محدود ہو گئی۔ ہم ہر شام مرتے رہے اور ہر صبح دوبارہ زندہ ہوتے رہے۔

ایک وسندرا کئی وسندراؤں میں بٹ گئی۔ کبھی دن وہ نئی نویلی دُلہن کی طرح لجاتی، سر پر ساڑھی کا پلو ڈال کے آتی اور میرے سامنے لجائی سی بیٹھ جاتی۔ کبھی وہ ایک شوخ و شنگ نو عمر لڑکی کی طرح پھڑپھڑاتی آتی اور اپنے بازوؤں میں مجھے گھیر کے لیجاتی۔ کبھی وہ ایک عمر رسیدہ خاتون کی طرح گھمبیر چہرے اور سنجیدہ آنکھوں کا خول چڑھائے آتی اور مجھے گھر کا، گرہستی کا اور بچوں کا احساس دلاتی۔

دل کے آئینے کی دُھند گہری ہوتی گئی۔ گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کی سطح بالکل ڈھک گئی۔ اُس دن وسندرا بالوں کو ایلورا کی مورتیوں کے ڈھنگ میں سنوار کر آئی تھی۔ میں دیر تک اس کے بالوں کو دیکھتا رہا۔

"راؤ! یہ تم آجکل میرے بالوں کو غور سے دیکھتے رہتے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وجہ؟ کوئی وجہ نہیں۔"

"ارے! کہیں تم مجھ سے پیار تو نہیں کرنے لگے ہو؟"

ہنسی کا ایک چھپاکا بکھر گیا۔ روم روم اور انگ انگ سے خوشی کا ایک پیام اُبھر آیا۔ میں دیر تک اِس پیغام کو تکتا رہا۔ اور اِس پیام کی پھوار میں نہاتا رہا حتیٰ کہ وسندرا اُٹھ کے چلی گئی۔ بہت دیر کے بعد میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا درخت کی ایک ٹہنی پر چند زرد پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اور کسی گمنام کیڑے کا تموج دھاگوں میں بکھر رہا تھا۔ یہ تو خزاں کی علامت ہیں۔ تو کیا بہار چلی جائے گی؟

اُس رات دل کے آئینے پر وسندرا کا چہرہ پہلی بار نمودار ہوا۔ بالوں میں خوشبو کی نسیم اور آنکھوں میں خوشی کی کرن لئے۔ چہرہ کنول کی پتی کی طرح شاداب اور ماتھے پر شفق کا عکس۔

کروں گی۔" اُس نے اُکتاہٹ سے کہا۔

میں جھینپ گیا۔ جو سوکھا ایک جھونکا کہیں قریب سے ہی گزر گیا۔

گر تمام کو باتیں نہیں ہو سکیں کچھ خریداری ضرور ہو گئی۔ ایک دکان میں اُس نے میری پسند کی ساڑھی خرید لی۔ جب میں پرس نکال کر پیسے دینے لگا تو اُس نے مجھے ایک خشمگیں نگاہ سے دیکھا۔ میں اس کو ایک طرف لیجا کر اصرار کرنے لگا۔۔۔

"نہیں ایمی یہ نہیں ہونے دوں گی؟"

"کیوں نہیں۔۔۔؟"

"نہیں تمہارے ساتھ میں ایسا نہیں کر سکتی مائق۔"

اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے کاؤنٹر پر جاکے بل ادا کر دیا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔ کچھ ندامت سی محسوس ہوئی۔ تھوڑا سا غصہ بھی ذہن میں بھر گیا۔ کیوں نہیں؟ آخر کیوں نہیں۔۔۔؟ میری زبان گنگ ہو گئی۔ پھر ہم ایک ریستوراں میں داخل ہو گئے۔ چائے کا آرڈر اس نے خود ہی دیا میں خاموش رہا چائے کا ایک کپ بنا کر اُس نے خود میرے سامنے رکھا، میں خاموش رہا۔ میں نے دیکھا وہ کچھ بے چین سی ہو گئی ہے۔ کوئی اضطراب سا اُس میں اُبھر آیا ہے۔۔۔ اور زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اُس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں اور اس کی حرکات سنجیدہ دیکھیں

"تو کیا تم بھی مجھے وہی سمجھتے ہو مائق؟"

اچانک میں ہنس پڑا۔ اس لڑکی کی سنجیدگی تو شوخی سے بھی بدتر ہے۔

"ڈر گئیں کیا؟"

"تم نے مجھے واقعی ڈرا دیا تھا۔۔۔ تو یہ تو یہ ڈر بھی کتنی عجیب چیز ہے۔

ہاں یہ ڈر واقعی ایک عجیب چیز ہے وسندرا۔ زندگی کا ایک خاص وقفہ اس کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور زندگی اسقدر مختصر۔۔۔

اب وسندرا اور میں باقاعدہ دوست بن گئے تھے عجیب طرح کی دوستی تھی یہ

میں اُنڈیلنا شروع کی ۔۔۔ میرے دروازے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"بھئی ورسدا۔ میں بھی آ گیا ہوں۔ ایک کپ میرے لئے بھی بنا دیا"

"آپ لوں سب کے سامنے مجھے چائے بنانے کے لئے مت کہا کیجئے"

اس نے بے حد شستہ اور دھیلے لہجے میں کہا۔ میرے پاؤں جم گئے ۔۔۔ ایسا لگا جیسے کسی نے بھری محفل میں مجھے تھپڑ مار دیا ہو ۔۔۔ وہ میری حالت بھانپ گئی ۔۔۔ اس نے ایک ادا کے ساتھ اپنا جملہ پورا کیا۔

"مجھے شرم لگتی ہے"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی رمیل میں شرم ہے۔ کیا عجب کہ اس رمیل کے کسی کونے کھدرے میں وہ موتی بھی موجود ہو جسے پیار کہتے ہیں۔

اس رات میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کے آئینے کے آس پاس ایک انجانی سی خوشبو تیر رہی ہے ۔۔۔ اور آئینے کی سطح رہ رہ کر بخار بخار کے دھندلا جاتی ہے۔ اور اچانک اس احساس کو بھانپ کر میں ڈر گیا اس خوشبو کو سونگھ کر میں ڈر گیا۔ کئی خوشبوئیں جان لیوا بھی تو ہوتی ہیں۔ کئی احساس قاتل بھی تو ہوتے ہیں۔

میں نے ڈرتے جھجکتے، بچتے بچاتے آئینے پر سے ساری دھند صاف کر دی۔

"شام کو میرے ساتھ بازار چلیے گا؟"

دوسرے دن ورسدا نے میرے خیالات کا طلسم توڑ دیا

"شام کو؟ کیوں بھلا؟" میں نے احتیاطاً پوچھا

"چند ایک چیزیں خریدنا ہیں ۔۔۔ ساتھ ساتھ کہیں بیٹھ کر چائے پیئیں گے ۔۔۔ کچھ باتیں کریں گے"

اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"باتیں؟ کون سی باتیں؟"

"بھئی حد ہو گئی مسٹر پرانس۔ اب یہ مجھے کیسے معلوم ہے کہ میں شام کو کیا باتیں

ایک عجیب طرح کی آگ تھی۔ نیم گرم سی آگ۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی آتش داں کے قریب ایک صوفے میں بیٹھی نیم وا آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس خواب کی تعبیر وسندرا تو نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وسندرا خواب نہیں حقیقت تھی پارے کی طرح بے قرار حقیقت۔

"آپ میرے لئے کون سا بریسلٹ لائیں گے۔ دو دن بعد میری سالگرہ ہے۔"

"گڑیا۔"

"اوہ! کتنا خوبصورت آئیڈیا۔"

میں تو سوچ رہا تھا، وہ کٹ کے رہ جائے گی۔ مگر اس کو کاٹنے کے لئے کوئی بھی چیز تیز تر نہیں۔

اب وہ گڑیا اس کے خاص کپڑوں کی اٹیچی میں نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی رہتی ہے۔ وسندرا کا کہنا ہے کہ اتنا لازوال تحفہ آج تک اُسے کسی نے نہیں دیا ہے۔

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے یہ گڑیا دیکر مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں موم کی گڑیا ہوں۔۔۔ تو آپ نے غلطی کی ہے۔"

"میرا یہ خیال کبھی نہیں تھا۔" میں نے احتیاطاً جھوٹ بولا۔

"اور یہ خیال کرنا بھی حماقت ہے۔ عورت ہاتھ لگانے سے کبھی میلی نہیں ہوا کرتی آپ جو باہر سے اتنے اُجلے اُجلے اور بے داغ نظر آتے ہیں۔ کیا معلوم آپ کا دل بھی اتنا ہی اُجلا اور بے داغ ہو۔"

بس کرو وسندرا۔ دل ہی تو ہے جس کے شیشے کو میں نے صاف رکھا ہے آج تک اس پر کوئی سایہ نہیں پڑا ہے۔ اس کی سطح سے کوئی جو محسوس ہو کے نہیں لگی ہے۔۔ یہ آئینہ بے داغ ہے۔ جیسے ابھی ابھی انڈے سے نکلا ہوا نرم گرم چوزہ۔۔۔ اس کو ہاتھ میں کبھی نہ لینا، کہتے ہیں انسان کے ہاتھ میں زہر ہوتا ہے۔

ایک دن اسٹاف روم میں سبھی بیٹھے تھے چائے آگئی۔ وسندرا نے پیالیوں

ترقی پسند، کچھ کچھ آزادی پسند ہوں، ایک ایسی تمغہ ہے جس کو ہر کوئی گیٹی مار کر اُتار ما جاتا ہے
مگر میں اس تمغے کو اُتارنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ میری گیٹی میں اِمادم تم نہیں تھا
ایک مسکراہٹ کی قیمت کانجی درم کی ساڑھی۔
چائے کا ایک کپ سا کر دینے کی قیمت ایک سونے کی گھڑیا۔
ایک ساتھ سنیما دیکھنے کی قیمت دو سُوٹوں کا کپڑا۔
اس سے آگے کی کوئی چیز لکاذ نہیں تھی۔ اور یہ بھی جانتے تھے کیونکہ وہ صرف خوبصورت اور چالاک ہی نہیں تھی، بلکہ بے حد سخت طبیعت کی مالک بھی تھی۔
"اندر تو آنے دیجئے "
ایک دن اُس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو میرے پاؤں چوکھٹ میں جم گئے۔
" آپ تو یوں کانپ رہے ہیں، جیسے میں آپ کی گرفتاری کا وارنٹ لے کے آئی ہوں "
" جی ، نہیں تو "
اُس نے ایک قہقہہ مارا۔ اُف ایک صدر محمد کر دینے والا قہقہہ۔ حالات کا منہ چڑاتا ہوا سا۔ وقت پر طنز کرتا ہوا سا میں صرف اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا اس لڑکی کو اتنے آپ پر کتنا فخر تھا۔
" میں تو ماں جی سے ملنے آئی ہوں۔ راستے میں اس ٹائی پر نظر پڑی، سوچا خرید لوں خرید کے اب سوچتی ہوں کہ اس کا کیا کر دوں
" رکھ لیجئے۔ جلدی یا بدیر کام آئے گی "
" آپ رکھ لیجئے "
وہ ٹائی میری گود میں پھینک کے اندر ماں جی کے پاس چلی گئی اور میں باہر بیٹھا ہوا ایسی ہی آگ میں جلتا رہا۔

میرے ہاتھ میں جانے کی پیالی تھرائی ایک عجیب سی آواز پیدا ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے سردی کی شدت سے کسی شخص کے دانت بج اُٹھے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے وسندرا کے چہرے پر ہنسی کا ایک خفیف سا سایہ پھر گیا دوسرے لمحے اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مگر شرط یہ ہے کہ آپ گرا رہا ہیں"

جی ہے جی نہیں بھلا اس میں گرا جانے کی کیا بات ہے"

مگر کالج سے میرے گھر تک کا راستہ اُس دن بہت لمبا ہو گیا۔ کیونکہ یہ راستہ وسندرا کے ساتھ بازار میں سے گزر کر طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وسندرا جانی پہچانی تھی۔ میں آتا جاتا پہچانا نہیں تھا اسلئے یہ راستہ ہم ادھری گلیوں میں سے گزرتا ہوا میرے گھر کی دہلیز تک چلا آیا گھر کے پاس پہنچ کر وسندرا نے دھیرے سے کہا۔

"ہم لوگ تو بازار کے راستے سے بھی آ سکتے تھے۔ اگر بس آ جاتا تو"

"مگر یہ تو میں آپ کو شارٹ کٹ سے لے آیا ہوں"

وسندرا نے جواب میں میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں اُس کی آنکھوں میں وہ جلتا ہوا سوال دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اسقدر بزدل ہوں"

اب میں اس کو کیسے بتاتا کہ وہ کتنی پاگل تھی۔ اب میں اُس کو کیسے بتاتا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کیا کہتے تھے سوچتے تھے۔ سوسائٹی میں زندہ رہنے کے لئے، سماج میں زندہ رہنے کے لئے، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں زندہ رہنے کے لیے اُجلی تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ ایک ذرا یا ذرا لڑکھڑایا تو ساری عمر کا بھرم ٹوٹ جائے گا ایک ذرا ٹھوکر کھائی تو آگے پیچھے کی تمام تاریخ مسخ ہو گئی انسان کو کہاں آزادی ہے ؟ یہ جو قدم قدم پر اَن دیکھی اور انجانی بیڑیاں ہیں، یہ تو مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی ساتھ رہتی ہیں اگر وسندرا ان بیڑیوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی تھی تو اس سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ آزاد ہے ۔۔۔ ایک خوبصورت کنواری لڑکی، جس کے خیالات کچھ کچھ باغیانہ، کچھ کچھ

وسندرا تو موت کی دیوی ہے ایورت

وسندرا تو سیدھی سادھی کارے مام ڈیو

پھر میں نے یہ گڑیا وسندرا کو کیوں دیدی ؟

"پروفیسر ائس! میں آج آپ کے ساتھ جائے پیوں گی ؟"

"میرے ساتھ ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔۔" میں لوکھلا گیا اسٹاف روم میں مجھے سہارا دینے والا کوئی نہ تھا گھوش ای کلاس میں بیٹڈکوں کی چیر پھاڑ کر رہا تھا۔ ایورٹ ای کلاس میں کوئرج کی تحلیل نفسی کر رہا تھا۔ مام ڈیو ای کلاس میں وحشت کی انگوٹھی کھو رہا تھا۔

"نہ ایسے ہو سکتا ہے پروفیسر کہ ابھی جائے آجائے گی اور ہم دونوں کپ ہاتھ میں لیکر اسے پی ڈالیں گے ۔"

وسندرا اسٹاف روم میں ایسا عمل کر رہی تھی جو مجھ پر استعمال کر رہی تھی۔ اس کی ہنسی کا چھا کا کمرے میں گونج اٹھا اور ساتھ ہی چپراسی جائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوگیا۔

اس چپراسی نے اس سے پہلے وسندرا اور گھوش کے لیے جائے لائی تھی وسندرا اور ایورٹ کے لئے جائے لائی تھی۔ وسندرا اور رام ڈیو کے لئے جائے لائی تھی ۔۔

آج یہ وسندرا اور میرے لئے جائے لایا تھا۔ وسندرا نے ایک کپ سامنے مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر! میں ہر شخص کے لئے جائے نہیں ساتی ہوں "

"پھر میرے لیے کیوں یہ تکلیف اٹھائی ہے آپ نے " میں نے ڈرتے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اور میں ہر شخص سے ایسے سوال سنتی ہوں " اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا میں نے جائے کے دو ایک گھونٹ حلق سے اتارے وسندرا نے جائے کی ایک اور پیالی ساگ اسے سامنے رکھی اور پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگی۔

"پروفیسر! میں آج آپ کے گھر جا رہی ہوں "

چہرے والی اور سنجیدہ آنکھوں والی وسندرا۔ اور اس کا سہاسا، کمزور سا سفید ہاتھ میرے بازو کا سہارا لئے۔ نہیں! مجھے ان حدوں کے اُس پار جانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھ میں اتنی دُور تک جانے کی طاقت نہیں ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تم بوڑھی ہو گئی ہو وسندرا۔"

"نہیں! میں کبھی بوڑھی نہیں ہو جاؤں گی۔ یہ تو تم کو جاننا چاہیئے تھا۔"

ہاں یہ مجھے جاننا چاہیئے تھا۔ میں اب کبھی وسندرا کی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ اُس نے دوبارہ اسکارف سر پر باندھ لیا ہے۔ اب اُس کا ہاتھ میرے بازو کا سہارا تلاش کر رہا ہے۔ ابھی اس موڑ کے بعد اس کا مکان آئے گا۔

ابھی چند لمحوں کے بعد مجھے اکیلا واپس آنا پڑے گا۔ برف بدستور گر رہی ہے اور راستے سارے روپہلی تار اُلجھ کر ادر سلجھ کر کانپ اور دھرتی کی ہر چیز کو ڈھک رہے ہیں۔ راستہ تو تلاش کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ واپسی کا سفر کیسے طے ہوگا؟

مجھے اُس آتشدان کا خیال آتا ہے، جس میں کوئلے اب تک سرد ہو چکے ہوں گے تھوڑی دیر پہلے یہ کوئلے دہک رہے تھے، ایسی لال رنگ میں لکالے ایک دوسرے کے ساتھ ہم کلام تھے۔ اور میں اور وسندرا آتشدان کے سامنے بیٹھے اُس گڑیا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ مگر تب تو اُس نے مجھے وہ لفافہ نہیں دیا تھا۔ جو اس وقت میری اندرونی جیب میں پڑا پڑا سلگ رہا ہے اور رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر مجھے کچھ کہے دے رہا ہے۔

وسندرا کہہ رہی تھی کہ اُس نے وہ گڑیا اپنے خاص کپڑوں کی تہہ میں سنبھال کے رکھی ہے۔ جانے اُس گڑیا کے دل میں اب تک کتنی خوشبو بس گئی ہوگی۔ کہیں یہ گڑیا تو مر جائے گی۔ کیونکہ ہر وہ چیز مر جاتی ہے، جس کے دل میں وسندرا اپنی خوشبو بھر دیتی ہے۔

وسندرا تو وہیں کیا ہے کھو تیں۔

آلی راہ کا مسافر

میرے کمرے کا لیمپ بڑی جدوجہد میں مشغول ہے بے چارا! باہر برف لگاتار گر رہی
ہے، اور ایک دودھیا رنگ کی چادر میرے کمرے کے بالکل سامنے تن گئی ہے جلدی قدم چل کر
لیمپ کی روشنی اس چادر کی دودھیلی تاروں میں اُلجھ کر کھو گئی ہے۔ جیسے دل کے طاق پر
رکھا ہوا کوئی ارماں کبھی کھو جاتا ہے۔ نظروں کے سامنے بھی ہوتا ہے، مگر پھر بھی نہیں ملتا۔
ٹٹولتے ٹٹولتے ہاتھ کی اُنگلیوں سے مس بھی کرتا ہے، مگر پھر بھی ہاتھ نہیں آتا۔
لگتے ایک عجیب طرح کا اُجالا پھیل گیا ہے اس اُجالے میں کوئی آواز نہیں
آ رہی۔ کوئی صدا کہیں سے نہیں اُبھرتی مکمل سناٹا۔ حرف حرف جیسے چاپ گر رہی ہے
جانے کون سے نقش مٹانے کے لئے۔
ایک سناٹا تو میرے اندر بھی کہیں اُبھر آیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے سارا اندر
کا شور ختم ہو گیا ہے، حتی کہ پسلیوں کے اندر کی وہ آواز بھی مدھم سی پڑ گئی ہے اس آواز کو
دھڑکن کہتے ہیں۔۔۔ اس جگہ کو دل کہتے ہیں۔۔۔ مگر دل کہاں ہے؟

میں محسوس کر رہا ہوں کہ وستدرا کی نگاہیں میرے چہرے کا طواف کر رہی ہیں میں
اسے گالوں کے آس پاس ان نگاہوں کی گرمی محسوس کر رہا ہوں مگر میں وسدرا کی طرف
نہیں دیکھوں گا میں نے اپنے جیکٹ کا کالر اوپر کھینچ لیا ہے ۔۔۔ وستدرا نے بھی اپنے سر پر
اسکارف باندھ لیا ہے۔
اب اُس کا ہاتھ میرے بازو کا سہارا تلاش کرے گا ۔۔۔ اور پھر ہم دونوں اس
گرتی ہوئی برف میں، اس محد سنّاٹے میں، اس بہت پست کرنے والے دُھندلکے میں
ایک سفر پر روانہ ہوں گے ۔۔۔
سفر لمبا نہیں ہے۔ چند فرلانگ یا اس سے بھی ذرا آگے ۔۔۔ اس کے بعد وستدرا
اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی مجھے آخری بار دیکھے گی ۔۔۔ میں بھی اُسے آخری بار دیکھوں گا۔
شاید دیکھو بھی، یا نہیں۔ کئی ساعتوں کے لیے ہوتے ہیں جہاں آدمی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کیے
اپنے آپ کے اندر کہیں ڈوب جاتے ۔۔۔
برف چُپ چاپ گر رہی ہے ہمارے قدموں کے نشان ہمارے ساتھ ساتھ ہمارا
پیچھا کرتے ہوتے چلے آتے ہیں جب میں تھوڑی دیر کے بعد اکیلا واپس آجاؤں گا، تو یہ
سارے نشان برف سے ڈھک گئے ہوں گے۔ اور میں ان کو تلاش کرتے کرتے کھو
جاؤں گا ۔۔۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"
"کچھ بھی نہیں ۔۔۔ میری آواز کچھ کچھ اجنبی سی لگ رہی ہے وستدرا رُک گئی ہے
اُس کے شانوں پر اور بازوؤں پر اور سر پر اور سینے کی گولائیوں پر ایک مِس سی برف
کی تہہ اُبھر آئی ہے۔ اُس نے اسکارف کھول کے اسے جھاڑنا شروع کیا ہے اور اس دوران
اس کے بالوں پر برف گر رہی ہے ۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے بال سفید ہو گئے ہیں ۔۔۔
بالکل سفید ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت اور فاصلے کی تمام حدوں کو پار کر کے میں جانے
کہاں چلا گیا ہوں ۔۔۔ اور میرے سامنے وستدرا کھڑی ہے سفید بالوں والی گمبھیر

آگہی راہ کا مسافر

برآمدے کا لیمپ بڑی جد و جہد میں مشغول ہے بے چارا! باہر برف لگاتار گر رہی ہے، اور ایک دودھیا رنگ کی جھالر برآمدے کے بالکل سامنے تن گئی ہے حد ہی قدم جل کر لیمپ کی روشنی اس جھالر کی روپہلی تاروں میں اُلجھ کر کھو گئی ہے جیسے دل کے طاق پر رکھا ہوا کوئی ارمان کبھی کھو جاتا ہے نظروں کے سامنے بھی ہوتا ہے، مگر پھر بھی نہیں ملتا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے ہاتھ کی انگلیوں سے مس بھی کرتا ہے، مگر پھر بھی ہاتھ نہیں آتا۔

آگے ایک عجیب طرح کا اُجالا پھیل گیا ہے اس اُجالے میں کوئی آواز نہیں آرہی۔ کوئی صدا کہیں سے نہیں اُبھرتی مکمل سناٹا صرف برف چپ چاپ گر رہی ہے جانے کون سے نقش یا چھپانے کے لئے۔

ایک سناٹا تو میرے اندر بھی کہیں اُبھر آیا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے سارا اندر کا شور ختم گیا ہے، حتیٰ کہ پسلیوں کے اندر کی وہ آواز بھی مدھم سی پڑ گئی ہے اس آواز کو دھڑکن کہتے ہیں — اِس جگہ کو دل کہتے ہیں — مگر دل کہاں ہے؟

آ گیا، اور جلنے کی بدبو کو دور کہیں لے گیا۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر گھاس آگ آئی ۔۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ پرندے لوٹ آئے ۔۔ ایک بدبُدبر جانے کہاں سے آکر میری چھاتی پر اپنی لمبی چونچ سے ٹھونگیں مارنے لگا۔ شاید۔ شاید یہ مجھے پتھر کے خول سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ پر میں سوچ رہا ہوں ۔۔ سوچ رہا ہوں، کیا میں اس پتھر کے خول سے باہر نکلنا چاہتا ہوں؟ سوچ رہا ہوں۔

لڑکے! ارے او لڑکے! میری بصیرت کام نہیں کرتی۔ ذرا تم ہی آس پاس اور قریب نظر ڈال کے مجھے بتا دو ۔۔ کیا میں اس پتھر کے خول سے باہر آجاؤں؟

———★★★———

دل میں ہراس حنگار رہا تھا، اور ابھی دسترس سے دور ہو گیا تھا جو مقدر کی طرح ابھی میری پیشانی پر جگمگا رہا تھا اور ابھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا خیال آتا ہے۔ خیال آتا ہے، کیا جو میں نے ایک درم میں خریدا تھا، وہ فقط ایک غبارہ تھا؟

کوئی تعجب نہیں جو یہ لڑکا مجھے دیکھ نہیں پا رہا ہے۔ اس کی بصیرت زائل ہو سکتی ہے۔ اس کی گفتار بھی قائم ہے اس کے کان آواز سے انسان کی آواز سے، آسمانی عرف میں صدیوں کی دھول سمٹ سمیٹ کر پتھر میں تبدیل ہو گیا ہوں اور شاید مگر شاید نہیں، یقیناً یہ لڑکا میری چھاتی پر بیٹھا اپنے رنگ برنگے غبارے کی واپسی کا منتظر ہے رفتہ رفتہ میری ہی طرح یہ لڑکا بھی پتھر میں تبدیل ہو جائے گا۔ پھر ایک اور ماں ایک ڈالر دے کر یا ایک یا دو ڈالر دے کر یا ایک پن دے کر اپنے چھوٹے بچے کو بازار بھیج دے گی کہ زہر حسن قدر مہلک ہوتا ہے، تریاق بھی اسی قدر کارگر ہونا لازم ہے پھر وہ چھوٹا سا لڑکا بازار میں ایک غبارہ خریدے گا۔ مگر ۔۔۔ یہ آواز؟

یہ کیسی بھیانک آواز؟ جیسے ایک ساتھ تمام پہاڑ بھک سے اڑ گئے ہوں اور ان کا لاوا ایک چھتری کی مانند اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہے اور سورج کئی پرے پیچھے اتر آیا ہے چاروں طرف جلنے کی مہک پھیل گئی۔ جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تم بھی دیکھ رہے ہو لڑکے؟ میں نے چلا کر لڑکے سے پوچھا۔ مگر لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

یہ آگ کیسے جلا رہی ہے لڑکے؟ میں پوچھ رہا ہوں۔ اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اس کی نحیف سی، مریل سی ہنسی مجھے سنائی دے رہی ہے۔ میں نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔ ہاں وہی تو ہے۔ میرا رنگ برنگا غبارہ۔ پھر سے نمودار ہو گیا ہے کئی غبارے نمودار ہو گئے ہیں۔ بے شمار رنگ برنگے غبارے ارمانوں کے، خوابوں کے، تصویروں کے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان تمام رنگ برنگے غباروں نے سورج کو اوپر اچھال دیا اس کی مرد جہ بلندی پر ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا نہ جانے کہاں سے

جب اُسے میرا الو ہیٹیا تھا، اور بار بار کراور تھک ہار کر قہوہ خانے کا رُخ کرتا تھا، تو وہ اپنے
درد کی ٹیسیں سہلانے کے لئے مجھے پیسے دے کر باہر بھیج دیتی تھی۔ یا جب میرے تار تار پیرہن کو
رفو کرتے کرتے سوئی اُس کی اُنگلی میں چبھ جاتی تھی، اور اُنگلی سے ہوتی ہوئی دل تک اُتر
جاتی تھی۔ تو وہ مجھے پیسے دے کر بازار بھیج دیتی تھی۔ یا جب حکایتیں سنا سنا کر سوکھی ہوئی
ماں کے ٹکڑے میرے حلق سے نیچے اُتارنے کی کوشش میں، اس کے اپنے گلے میں کوئی پھانک
سی پڑ جاتی تھی، تو وہ میری بھیگی ہوئی آنکھیں اپنے میلے کچیلے آستین سے پونچھ کر مجھے پیسے
دے کر بازار بھیج دیتی تھی۔ اور ایک دن ـــ کر وہ داستان تو میں بیان کر ہی چکا ہوں۔
پھر اس پتھر پر بیٹھے بیٹھے اپنے رنگ برنگے غبارے کا انتظار کرتے کرتے وہ تمام رموز
آہستہ آہستہ مجھ پر آشکار ہوتے اور رہاں دمکاں کی زنجیر سے سدھا ہوا وقت میرے
آگے سے گذر گیا رات اور دن کی آہنی گرفت میں جکڑی ہوئی دنیا میرے سامنے سے
رواں دواں آگے ـــ اور آگے نکل گئی۔ سمندروں کا پانی خشک ہو کر ان گنت غباروں
کی طرح اوپر ہی اوپر آسمان کی جانب لپکا اور باراں بن کر اچھلتا کودتا زمین پر گر گیا۔
طغیانی آ گئی ـــ اور سمندر نے ایک بار پھر اس سنگلاخ زمین کو کہ جس پر بنی نوع آدم
کا گزر ہے، غرق کرنا شروع کر دیا۔

شاید کوئی سوئی کی نوک اُنگلی سے ہوتی ہوئی، دل کے آر پار گزر کر اوپر ہی اوپر
لپکتی چلی گئی تھی آسمان کی جانب یا اس سے بھی پرے وسیع تر خلاء کی طرف اور بے شمار
غباروں میں چھید کرتی ہوئی زمین کے محور میں داخل ہو گئی تھی۔

ہاں مجھے یاد آیا ـ تب ایک بڑی کشتی میرے سامنے سے گزر گئی، جس میں نہ جانے
کون تھا۔ چند پرند تھے چند انسان تھے کہ جنہیں میں پہچان نہ سکا اور میں اس کشتی
پر سوار ... رنگ برنگے غبارے کی واپسی کا منتظر تھا، جو ایک پھیلاؤ
طر ... اور ابھی نہیں تھا۔ جو ایک خواب کی طرح ابھی میری
... او جھل ہو گیا تھا۔ جو ایک ... ارماں کی طرح ابھی میرے

نے ایسے قریب دیکھتے ہوتے کہا۔ اور تب میں سمجھ گیا کہ ایسے اوپر ہی اوپر اڑتے ہوئے غبارے کی طرف دیکھتے دیکھتے اس لڑکے کی بصیرت میں فرق آگیا ہے مجھے بہت رنج ہوا بلکہ میرے دل میں ایک کچوکہ سا لگا۔ میں نے اداس لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

"تنا لڑکے میری آواز تو تم سن رہے ہو نا ؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔ پر تم کون ہو، کہاں سے بول رہے ہو ؟"

"میں تمہاری ہی طرح کا ایک لڑکا ہوں میرا غبارہ بھی ایک دن اسی طرح میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اور میں بھی تمہاری طرح بیٹھا اس کے واپس آنے کا انتظار کر رہا ہوں"

'کب کی بات ہے ؟' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"یاد نہیں۔ شاید کل کی بات ہے۔ شاید سال بھر پہلے کی بات ہے، یا شاید سو سال پہلے کی بات ہے"

میری بات سن کر وہ چھوٹا سا لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر وہ ذرا سی یہ قہقہہ اس کے گلے میں اٹک گیا اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا تم بھی اپنی ماں کے لئے لسوار لینے گھر سے نکلے تھے ؟"

لسوار ؟۔۔ ہاں لسوار تو نہیں۔۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ؟

معلوم ہے نا۔ مجھے پندرہ پیسے دے کر ماں نے لسوار لانے کے لئے بازار بھیج دیا تھا۔ بازار میں رنگ برنگے غبارے بک رہے تھے گیس بھرے ہوئے غبارے غباروں کی طرف دیکھ دیکھ کر میں اپنی ماں کے لئے لسوار لانا بھول گیا۔ اور میں نے پندرہ پیسے میں غبارہ خرید لیا مگر۔۔ مگر چند ہی قدم چل کر غبارہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اب میں کون سا منہ لے کر گھر جاؤں ؟ یہ کہہ کر وہ لڑکا زار زار رونے لگا

اور اس لڑکے کی بات سن کر مجھے اپنی بات یاد آگئی مجھے بھی ماں نے پیسے دیکر بازار بھیج دیا تھا۔ تھوڑی سی افیم لانے کے لئے میری ماں کو افیم کھانے کی لت پڑ گئی تھی

تو وہیں ایک پتھر پر نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں بھی پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ میں بھی نڈھال سا، پژمردہ سا، بے حال سا، تھکا ماندہ سا بیٹھا تھا کیونکہ بہت پہلے میرے ہاتھ سے بھی اسی طرح ایک غبارہ چھوٹ کر آسمان کی جانب لپکا تھا۔ پھر اوپر ہی اوپر وسیع تر خلاء کی جانب چلا گیا تھا۔ اور نگاہ کی حد سے بھی پرے کہیں جا کر اوجھل ہو گیا تھا۔ اُس لمحے میں بھی خوب دہاڑیں مار مار کر رویا تھا اور رو رو کر اور تھک ہار کر اور اپنی متاع لٹا کر اور اپنی بے چارگی کا احساس پا کر اور اپنی بے بسی کا ڈراؤنا چہرہ دیکھ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ زماں و مکاں کی زنجیر سے سدھا ہوا وقت میرے آگے سے گزرتا گیا۔ گزرتا گیا اور میں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ رات اور دن کی گردش میں جکڑی ہوئی دنیا میرے سامنے سے رواں دواں آگے اور آگے نکل گئی اور میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ سمندروں کا پانی خشک ہو گیا۔ صحراؤں کی ڈھول چاروں طرف اُڑنے لگی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اور میں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ درختوں کے پتے جھڑ گئے اور پرندے ہجرت کر گئے اور میں بیٹھا رہا۔ اب تو یاد بھی نہیں کتنے لمحے گزر گئے، کتنے سال گزر گئے کتنی صدیاں گزر گئیں۔ میرا کھویا ہوا غبارہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔

چنانچہ میں نے اس چھوٹے سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف دیکھتے دیکھتے میں اُمید و بیم کی اُن جیتی ہوئی تمام منزلوں سے گزرتا رہا۔

"اے لڑکے! ادھر دیکھو۔ میری طرف" میں نے اُسے آواز دی۔ اُس نے دو ایک بار میری جانب دیکھا بھی، پر اُس کی نگاہوں میں کوئی پہچان نہیں اُبھری۔

"ارے میں یہاں ہوں۔ تمہارے قریب اس پتھر پر بیٹھا ہوں" میں نے دوبارہ آواز دی۔ اُس لڑکے نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا اور پھر اُس کی آنکھوں میں ہراس پیدا ہو گیا۔ اُس نے منہ بسور کر کہا "جانے کون بول رہا ہے، نظر تو کوئی آتا نہیں"

"کیا؟ میں تمہیں نظر نہیں آ رہا ہوں؟ تمہارے قریب تو بیٹھا ہوں"

"میرے قریب تو کوئی نہیں ہے۔ جانے کون ہے؟ کہاں سے بول رہا ہے" لڑکے

غبارے کی واپسی

کھیل ہی کھیل میں غبارہ اُس چھوٹے سے لڑکے کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور آسمان کی جانب لپکا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بہت دُور اُوپر چلا گیا۔ پھر اُس سے بھی پرے وسیع تر خلا، کی جانب جانے لگا۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں خالی لوٹ آئیں، کہ نگاہ کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ اُس حد سے پرے نگاہ بھی بے بس ہو جاتی ہے۔

پھر لوگوں نے لڑکے کی طرف دیکھا چھوٹا سا، مُنّا سا، سانولے سے رنگ والا شرمیلا سا، ڈرپوک سا لڑکا۔ پہلے تو وہ تالیاں بجاتا رہا۔ غبارے کو اوپر ہی اوپر لپکتا دیکھتا رہا۔ مگر جب غبارہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، تو وہ یکایک رونے لگا۔ بلکہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ دیکھنے والے تب تک لڑکے کی طرف دیکھتے رہے، جب تک وہ تالیاں بجا رہا تھا۔ پر ادھر اُس نے رونا شروع کیا، اُدھر لوگ دھیرے دھیرے جانے لگے۔ چنانچہ جب لڑکا اونچی آواز میں رونے لگا تو اُس کے آس پاس کوئی بھی دیکھنے یا سننے والا نہ تھا۔ حتیٰ کہ روتے روتے جب وہ تھک گیا

تو کہیں دے رہی ہو۔ ارے یہ تم جھالی کیوں بیٹھ رہی ہو۔ ہاں یہ تم نے اچھا کیا جو لفافے میں
سے پرکاش کا پُرزہ نکال لیا۔ قریب لاؤ تھوڑا اور قریب ——
" بہت دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ سوچا اب
مر جانا چاہیے مُکتی کا خیال رکھیئے گا —— چندر مُکھی"
دھانے آتما پاپی کہاں سے لائے وہ آکتار —— مُکتی چلی گئی دو ہلکے پیلے رنگ کے کاغذ
کا پُرزہ پھڑپھڑاتا ہوا دُور چلا گیا ہے —— خدا کے لئے اِس کاغذ کے پُرزے کو روک لو کہیں
یہ اِس ڈیوڑھی سے باہر نہ چلا جائے !! **

ایک کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔۔۔ باہر رات ہولے ہولے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ دُور پیچھے کہیں بادل
دم لے رہا تھا اور اسی اذیت ناک لمحے میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح یکایک میں بیدار ہو گیا جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا ہو۔ باہر اودھم مچا ہوا تھا
سنکھ زور زور سے بج رہے تھے۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آواز آ رہی تھی دُور
ڈیوڑھی میں کوئی آدمی چیخ رہا تھا۔

رانی جی مر گئیں !!

یکلخت میرے کانوں پر پردے پڑ گئے گہرا سناٹا چھا گیا در و دیوار ساکت ہو گئے
آہ! یہ مجھ سے اُٹھا کیوں نہیں جاتا۔ یہ میرے ہاتھ پاؤں شل کیوں ہو گئے؟ یہ میری آنکھوں
سے آنسو کیوں اُمڈ پڑے ہیں؟

'مجھے رانی جی کے انتم درشن کرنے دو!'
کسی مرد نے روتے روتے پکارا۔

"نہیں۔۔۔ کسی نسوانی آواز نے روتے روتے کہا۔۔۔ سامنے دیوار پر سورج کی
روشنی بہت تیز ہے۔ اب یہ روشنی پیچھے کھسکنے لگی ہے۔

'ارے راستہ دو ارتھی آ رہی ہے' کوئی پکار رہا ہے۔ روتی آوازیں ڈیوڑھی
تک آ گئی ہیں۔ اب یہ آوازیں ڈیوڑھی کے باہر آ گئی ہیں۔ اب گہرا سناٹا ہے۔ سورج کی
روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی ہے۔ مدھم اور مدھم۔ اب اندھیرا ہے گہرا اندھیرا"
یہ ایک ساتھ ساری چیزیں کیسے تھم گئی ہیں؟۔۔۔ بے حسی کا عالم اِس عالم کو کیا کہتے!
کوئی انگ ہلایا نہ جا سکے، کوئی آواز نہ سنی جا سکے کیا اسے احساس ڈوبنا کہتے ہیں؟ وہ لڑکی
دروازے میں کھڑی ہے کچھ کہہ رہی ہے شاید۔ کیا کہہ رہی ہو موسی؟
ارے یہ تکلی جلا دی تم نے لیکن یہ چھوٹا سا شعلہ اتنے گہرے اندھیرے کا مقابلہ کیسے
کر سکے گا؟ اِس لمحے میں کیا لائی ہو؟ دیکھوں؟ آہ، کیسے پکڑ دوں؟ ہاتھ ہلایا بھی تو جاتے۔ تم
سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ کوئی انگ ہلایا نہیں جاتا نہ جانے کیا کہہ رہی ہو میری بات کا جواب

تو کہیں دے رہی ہو۔ ارے یہ تم چھپائی کیوں بیٹھ رہی ہو۔ ہاں یہ تم نے اچھا کیا جو لفافے میں
سے یہ کاغذ کا پُرزہ نکال لیا۔ قریب لاؤ تھوڑا اور قریب ——

"بہت دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ قدم ڈگمگانے لگے ہیں سو جانے
مرجانا چاہیئے رُکمی کا خیال رکھیئے گا —— چندرمکھی"

دھانے آتا پانی کہاں سے لائے یہ آنسار —— رُکمی چلی گئی وہ ہلکے پیلے رنگ کے کاغذ
کا پُرزہ پھڑپھڑاتا ہوا دُور چلا گیا ہے —— خدا کے لئے اس کاغذ کے پُرزے کو روک لو کہیں
یہ اس ڈیوڑھی سے باہر نہ چلا جائے !!

**

ایک کرسی میں ڈھیر ہوگیا۔ باہر رات ہولے ہولے ٹھنڈی ہو رہی تھی دور پیچھے کہیں بادل
جھم لے رہا تھا اور اسی ادھیڑ بن کے لمحے میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح یکایک میں بیدار ہوگیا جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا ہو۔ باہر اودھم مچا ہوا تھا
سنکھ اور نرسنگے بج رہے تھے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آواز آ رہی تھی دور
ڈیوڑھی میں کوئی آدمی چیخ رہا تھا۔

رانی جی مر گئیں!!

یکلخت میرے کانوں پر پردے گر گئے گہرا سناٹا چھا گیا در و دیوار ساکت ہو گئے
آہ! یہ مجھ سے اٹھا کیوں نہیں جاتا یہ میرے ہاتھ پاؤں شل کیوں ہو گئے؟ یہ میری آنکھوں
سے آنسو کیوں امڈ پڑے ہیں؟

'مجھے رانی جی کے انتم درشن کرنے دو'
کسی مرد نے روتے روتے پکارا۔

"نہیں۔۔ ایک نسوانی آواز نے روتے روتے کہا۔ سامنے دیوار پر سورج کی
روشنی بہت تیز ہے۔ اب یہ روشنی پیچھے کھسکنے لگی ہے۔

"ارے راستہ دو ارتھی آ رہی ہے" کوئی پکار رہا ہے روتی آوازیں ڈیوڑھی
تک آگئی ہیں اب یہ آوازیں ڈیوڑھی کے باہر آگئی ہیں اب گہرا سناٹا ہے سورج کی
روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی ہے مدھم اور مدھم اب اندھیرا ہے گہرا اندھیرا!"
یہ ایک ساتھ ساری چیزیں کیسے تھم گئی ہیں؟ یہ بے حسی کا عالم اس عالم کو کیا کہیے،
کوئی انگ ہلایا جا سکے، کوئی آواز نہ سنی جا سکے کیا سارے احساس ڈوب گئے ہیں؟ یہ لڑکی
دروازے میں کھڑی ہے۔ کچھ کہہ رہی ہے شاید۔ کیا کہہ رہی ہو موسی؟

ارے یہ کلی جلا دی تم نے پگلی یہ چھوٹا سا بلب اتنے گہرے اندھیرے کا مقابلہ کیسے
کر سکے گا؟ اس لفافے میں کیا لائی ہو؟ دیکھوں؟ آہ، کیسے پکڑوں؟ ہاتھ ہلایا بھی تو جائے۔ تم
سمجھتی کیوں نہیں موسی؟ کوئی انگ ہلایا نہیں جاتا نہ جانے کیا کہہ رہی ہو میری بات کا جواب

"رجانے کیا ہوا ہے۔ ساری ساری رات جاگتی رہتی ہیں کبھی چھم چھم آنسو بہانے لگتی ہیں پرسوں کہا، میرے سارے کپڑے نکال دو سارے زیورات نکال دو پھر باری باری اُن کپڑوں کو پہننے لگی۔ زیوروں کو پہن پہن کر اُتارتی رہی ساری رات یہی ہوتا رہا کوئی سایہ ہو گیا ہے شاید کبھی رات کو اُٹھ کر سنگھار کرنے لگتی ہے۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگتی ہے۔ مجھ سے اُس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کل رات اچانک سارے کپڑے پھاڑ دیئے۔ کہنے لگی دم گھٹ رہا ہے۔"

"کسی ڈاکٹر کو بُلایا تھا؟"

"کیسے بُلاتی بیٹا، وہ مانے تب نا۔ کہتی ہے مجھے کچھ نہیں ہوا ہے تم بتاؤ کیا کروں بیٹا بہت پریشان ہوں اس لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"میں تو جا رہا ہوں موسی، میں نے جواب دیا

رُکمی ایک لمحے کے لئے جیسے ٹھہر سی گئی۔ جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آگیا

"چلے جاؤ گے، ٹھیک ہے چلے جاؤ۔ اُس نے تھکی سی آواز میں کہا۔

موسی! میرے پاگل پن کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ بھول جانا مجھے اور۔۔۔

"ہاں بیٹا، ضرور بھول جاؤں گی۔ اُس دن مجھ پر پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ میں روتی ہوئی رانی جی کے پاس گئی اور سب کچھ رانی جی سے کہہ دیا۔

"موسی!" میں چیخا۔ "موسی! تم نے بہت بُرا کیا ہے اُف! اب میں زندہ کیسے رہوں گا!

"اچھا کیا بیٹا! تم نہیں جانتے، میں رانی جی سے کتنا پیار کرتی ہوں میرا باپ، میرا پتی، میرا بیٹا سب کچھ وہی ہے۔ کیسے رہتی اُس سے؟ بس اُس نے ہلکے سے مُسکرائی اور کہا رُکمی، بھول جاؤ اس بات کو۔"

ہائے رُکمی تم نے یہ کیا کیا مجھے بیچ میدان ننگا کر دیا۔ اب میں کیا کروں، میں کل صبح آئینے میں اپنا چہرہ کیسے دیکھوں گا پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ رُکمی کب اُٹھ کے چلی گئی میں جلدی جلدی اپنا سامان باندھنے لگا اب اِس شہر میں میرے لئے کوئی بسیرا تھا تھک ہار کر میں

ہاتھ جوڑوں گی، اُس کے پاؤں "

"موسی — !"

"ایسا نہ کہو موسی! ایسا نہ کہو۔ میں اِس قابل نہیں ہوں"

"اچھا اگر تو نہ بتائے گا، تو میں جا کے ابھی ہیرا چاٹ لوں گی!"

میں رُکمی کی آواز سُن کر لرز گیا اُس کی آواز میں اٹل ارادہ تھا میں نے اُس کی آنکھوں

میں جھانکا۔

"بس سُن پاؤ گی"

"تم بتاؤ تو دیکھو بیٹا"

"چندر مکھی"

اچانک رُکمی کی آنکھیں بجھ گئیں ایک لمحے کے لئے اُن آنکھوں میں حیرت اور خوف کا

سایہ سا تیر گیا۔ پھر اُن میں سُرخی چھانے لگی شدید غصے کی سُرخی! پھر اُس کی آنکھیں صاف ہو

گئیں اور دوسرے ہی لمحے رُکمی بھاگ کر کمرے سے چلی گئی۔

بہت دن بیت گئے رُکمی پھر کبھی میرے پاس نہ آئی مجھے انتظار بھی رہا کہ رُکمی انتظار؟

ایک ہلکا سا، دھیما دھیما سا درد اُسی طرح قائم رہا بہت دُکھ دیتے ہیں آپ کو کئی اذیتوں سے

گزرنا۔ آخر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں چلا جاؤں گا۔ یوں کسی کی تپسیا بھنگ کرنے کا مجھے

کوئی حق نہیں — اور اُسی دن شام کو رُکمی سات مہینے کے بعد میرے پاس آئی بیٹھتے ہی اُس

کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی

"کیا بات ہے موسی"؟

رُکمی کی ہچکیاں بندھ گئیں دیر تک اُس کی ہچکیاں کمرے کی بوجھل فضا میں تیرتی

رہیں۔

"بیٹا! رانی جی کی طبیعت بہت خراب ہے!"

"کیوں، کیا ہوا ہے اُن کو"؟

کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ چپ کیوں لگ گئی ہے۔ یہ چہرہ کیوں زرد ہو گیا ہے تمہارا۔"
اتنے دنوں کے بعد آخر نرگس سے رہا نہ گیا پوچھ ہی بیٹھی
"کچھ موسی! ٹھیک تو ہوں تمہارا وہم ہے۔"
نرگس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ دیر تک ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو دیکھتی رہی۔
ہاں! مجھ سے کیوں کہو گے، سوچتی ہوں اگر بیاہ کیا ہوتا اور گھر بسایا ہوتا تو تمہارے ہی جیسا ایک بیٹا میرا بھی ہوتا میں اُس سے پوچھتی، بیٹا! کیا دکھ ہے تجھے، تو۔۔۔ تو۔۔۔ نرگس کی ہچکی بندھ گئی
"یہ تم سے کس نے کہا موسی کہ مجھے کوئی دکھ ہے۔"
"تمہاری حالت نے۔ یہ شیو کیوں نہیں کرتے۔ نہ اتنی میلی قمیص پہنے تمہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اُترا ہوا چہرہ تو پہلی بار دیکھ رہی ہوں رات رات بھر کلی جگنانے کرے میں ٹہلتے رہتے ہو"
نرگس کے آنسو کلی کی روشنی میں موتیوں کی طرح دمکنے لگے میں دل ہی دل میں اُن موتیوں کو اپنی پلکوں سے چنتا رہا لیکن نرگس سے کچھ نہ کہہ سکا کیا کہتا، کیسے کہتا۔۔۔؟
رفتہ رفتہ ساری چیزیں دھندلا گئیں کوئی چاند نہ رہا۔ سورج کی روشنی نہ رہی درختوں کی ہریالی اور پھولوں کے رنگ نہ رہے صرف ایک شے باقی تھی لیکن اُسے بھی کسی ابھرے ارمان کی طرح زمانے سے چھپائے چھپائے رکھنا پڑا۔ ایک صحر پہلو میں پیوست تھا جسے رکھا نہیں جا سکتا تھا اور نکالنے بھی نہ دیتی تھی ایک آگ تھی دل میں جسے نہ سنبھالے بنتی تھی نہ بجھائے بنتی تھی جلا دو! میرے روم روم اور انگ انگ کو راکھ کر دو۔ ہائے! اس جلنے میں کتنی راحت تھی۔ کتنا سکون تھا
اُس دن نرگس چائے لائی تو میں حسب معمول آنکھیں بند کیے صوفے میں بیٹھا تھا
بیٹا! کیوں ستاتے ہو مجھے، دودن سے کھانا نہیں کھایا مجھ سے کہو کیا بات ہے۔ کون ہے وہ، کہاں رہتی ہے میں اُسے ان سفید بالوں کا واسطہ دوں گی۔ اُس کے آگے

باہر نہیں آتی کبھی دالان میں قدم نہیں رکھتی کسی برآمدے میں سے نہیں گذرتی کسی کھڑکی پاس نظر نہیں آتی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن رانی کی جھلک تک نہ دیکھ سکا نہ جانے کیوں یہ شوق چرایا تھا مجھے ، مائل ہی رہا رفتہ رفتہ یہ شوق مائل میں ہی مل گیا یہاں تک کہ ایک برس بیت گیا۔ اور پھر اچانک، بے تحری میں، بغیر کسی آہٹ کے ایک دن میں نے رانی کو دیکھا اڑکی ساتھ تھی ہاتھ میں ایک ہلکی سی ٹوکری پھولوں سے لدی ہوئی، سیاہ رنگ کی شال میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی، نظریں جھکائے، ماتھے پر کوئی شکن نہیں، چہرے پر کوئی تاثر نہیں صرف ایک نور کا ہیولہ سا اُس نے آہستہ سے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا ان نظروں میں کوئی خفگی نہیں تھی، کوئی درشتی نہیں تھی، کوئی حدر نہیں تھا بس نظریں تھیں دیوی کی مورتی کی نظریں پتھرائی ہوئی سی لیکن زندہ جاوید— میں مزید تاب نہ لا کر بھاگ گیا

شام کو ڈکی آئی۔

"بڑے تیر بہ ہو۔ دیکھ لیا رانی جی کو—؟"

"ہاں مگر بہت ناراض ہوئی ہوں گی تم سے کیا کہا؟"

کہنے لگیں کون تھا؟ میں نے کہا۔ رد بیسر صاحب تھے ڈیوڑھی کے کرایہ دار"

اُس رات میں نے ایک خواب دیکھا سُرمگیں پلکوں والا خواب، بھیگے بالوں والا خواب جیسے مرسا سا ہوا میرے اندر کے آئینے پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرے اور اُسے دُھندلا گئے۔

چودہ برس کی تپسیا کے بعد جب رانی نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک بے سروسامان انسان کھڑا تھا۔ تھر تھر کانپتا ہوا اور ان نظروں کی تاب نہ لا کر وہ انسان بھسم ہو گیا— وہ انسان میں تھا

نہ جانے یہ کون سی منزل ہوتی ہے، جب عقل تج دی جاتی ہے جب شعور کی گردش کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جب سوچوں کے بہاؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس منزل پر پہنچ کر جو بھٹک گیا وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔

جاتا۔ ان حویلیوں کی باتیں اور یہاں کے راز ڈیوڑھی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے ۔۔ ایک دن، جب مجھے اس حویلی میں رہتے ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے، میں نے رُکمی سے کہا

"موسی! مجھے ایک بار رانی جی کے درشن کرا دو۔"

میری بات سن کر جیسے رکمی کو سانپ سونگھ گیا۔ اُس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

"کیسی بات کرتے ہو شیا؟ اِس بڑھاپے میں مجھے ذلیل کرواؤ گے؟"

"کیوں؟ اتنی بے رحم ہے یہ تیری رانی؟"

"نہیں شیا! انسان کو یہ سوچو جس عورت نے چودہ برس تک کسی بھی مرد کو اپنی چھایا تک نہ دکھائی ہو اُسے میں کیسے کہوں کہ۔۔۔"

"چودہ برس؟ چودہ برس تو بہت ہوتے ہیں موسی! رام جی بن باس بھی تو چودہ ہی برس کا تھا۔"

"ہاں شیا! چودہ برس بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے اور رانی جی نے ان چودہ برسوں میں کبھی نہ تانکا، کسی کو پاس نہیں آنے دیا۔ وہ تو بہت پہلے ہی سورگباسی ہو گئے تھے۔ ایک میں بڑھیا رہ گئی ہوں، نہ کبھی بیاہ رچایا، نہ گھر گرہستی دیکھی، نہ اولاد دیکھی۔ عمر ہو گئی نوکرانی کا کام کرتے۔ اسی حویلی میں پیدا ہوئی، یہیں کسی دن مر جاؤں گی لیکن یہ زندگی کیا ہزار زندگیاں رانی جی پر نچھاور کر سکتی ہوں۔"

"ارے موسی! تم تو رونے لگی ہو سچ مچ؟"

شیا کیا بتاؤں تجھے۔ کبھی کوئی بات نہیں کرتی کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتی جو ملا کھا لیا، ملا تو رہی بس جپے جا رہی ہے۔۔۔ تیس برس کی ابھی اگلے سال ہو جائے گی۔"

"موسی! بہت خوبصورت ہے کیا؟"

"خوبصورت؟ تم خوبصورت کہتے ہو؟ میں کہتی ہوں، کوہ قاف کی پری سامنے آ جائے تو پانی بھرے۔۔۔"

اُس دن سے بس، مجھے رانی کو دیکھنے کا شوق ہوا لیکن کہاں دیکھوں، کیسے دیکھوں، کبھی

مقرر ہوئی، تیاریوں کا حکم دیا گیا ساری منڈی اور اس سے ملحق علاقوں میں سات دن کا جشن منانے کا اعلان کیا گیا سات دن کے بعد راجا کو برات لے کر زمیندار ٹھاکر ستے گوپال سنگھ کے ہاں جانا تھا اور چندر مُکھی کو بیاہ کر لانا تھا سات دن گذر گئے برات روانہ ہو گئی زمیندار کے ہاں پہنچی بھی ۔۔ لیکن جب وہاں سے واپس ہوئی تو اطلسی ڈولی میں چندر مُکھی دُلہن نہیں تھی ۔ چندر مُکھی بیوہ تھی تقدیر کا کتنا بڑا مذاق ایک لمحے پہلے چندر مُکھی دُلہن بن کر سولہ سنگھار کئے سہیلیوں کے جُھرمٹ میں بیٹھی چہک رہی تھی اور دوسرے لمحے ایک نوکر ہاتھ کا بیٹا، لڑکھڑاتا، تھرتھراتا ہوا آیا اور حیرت سا گیا ۔ راجا جی پر گولی چلائی گئی بارہ دری میں بیٹھے تھے دو گولیاں چلیں اور راجا جی کے دل میں اُتر گئیں ایک لمحہ یوں ہی پلک جھپکنے میں بیت گیا اور چندر مُکھی بیوہ ہو گئی،
اور بیوہ کو اطلسی ڈولی میں بٹھا کر لایا گیا کیونکہ ٹھاکر ستے گوپال سنگھ کی یہی مرضی تھی اور راجا رتن سنگھ کے بوڑھے ماموں کی بھی یہی مرضی تھی ۔ حویلی میں راجا نہ رہے تو کیا حویلی رانی سے بھی محروم رکھی جائے گی

سال دو سال تک پولیس خونی کو تلاش کرتی رہی، قتل کا مقصد جاننے کی کوشش کرتی رہی جائداد رقابت سے لے کر محبت کی رقابت تک سبھی چیزیں کھنگالی گئیں لیکن بے سود اور رفتہ رفتہ رانی چندر مُکھی کے دل میں جفا کے شعلے ماند پڑ گئے پھر ان شعلوں کی جگہ ایک گہرے بھیانک زخم نے لے لی، جو زہر کی طرح گہرا اور موت کی طرح بے کراں تھا ۔ حویلی میں رانی نے سب چیزیں تج دیں سادہ سنگھار، چاندی کے برتن اور سونے کے تکیے مخملی بستر اور کمخواب کے پردے قیمت ساڑھیاں اور ڈھیر بدل گئے اور ان چیزوں کے بدلے گیتا کو اپنا لیا روز اٹھارہ کی اٹھارہ ادھیایوں کا پاٹھ کرتی ۔ حویلی کے اندر رہتے ہوئے ٹھاکر دوارے میں اپنی پوجا کی گھڑیاں بتاتی صرف ایک نوکرانی رُکمی کو سامنے آنے کی اجازت تھی یہ رنگ اُس وقت بھی رہا جب حویلی سے حکم نامے جاری ہوتے تھے اور یہی رنگ جب بھی برقرار رہا، جب سرکار کے حکم نامے حویلی میں آنے لگے

نہ جانے رُکمی کو میرے ساتھ محبت کیوں ہو گئی تھی ورنہ یہ سب باتیں میں کیسے

وہ پچاس کنال زمین پر پھیلا ہوا باغ ہے، جس میں کبھی نہر بہتی تھی اور فوارے تھے۔ اب
تو نہر اور فوارے نظر نہیں آتے ۔۔۔ شلجم، گوبھی اور آلو وغیرہ کی کیاریاں ہیں البتہ وہ فصیل جو
اس باغ کے گرد تھی، اب بھی اُسی طرح کھڑی ہے اور وہ ڈیوڑھی بھی کھڑی ہے، جس کے دونوں
طرف، کہتے ہیں، دو وردی پوش سپاہی ہمیشہ کھڑے رہتے تھے لیکن اب صرف ڈیوڑھی ہی ڈیوڑھی
ہے اونچی، کھوئے ہوئے محراب تھامے، بادشاہ رفتہ کی حشمت، وعدے اور کئی رازوں کی
پاسبان!

کچھ چیزیں تو پلک جھپکتے میں بدل جاتی ہیں لیکن اس حویلی کی تاریخ دھیرے دھیرے،
مرحلہ بہ مرحلہ بدلی تھی پہلے جاگیریں گئیں، پھر بھینسیں گئیں، پھر کارندے، منشی، نوکر چاکر چوکیدار
گئے، پھر اصطبل کے گھوڑے گئے، پھر چاندی کے برتن گئے، پھر بڑے بڑے قالین اور ماحول
بکھر گیا۔ چودہ پندرہ برس میں یہ تبدیلیاں آئیں۔ اب بھی بہت کچھ باقی ہے تھوڑی بہت
رئیسی بھی ہے، بگھی گھوڑے کی جگہ کار آگئی ہے۔ نوکروں کی تعداد میں بہت کمی کر دی گئی ہے
چند چیزوں کو نئے سانچے میں ڈھالا گیا ہے جیسے حویلی۔ اِس کا ایک حصہ چھوڑ کر باقی حصوں کو
کرایہ پر دینے کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ اُس ایک حصے میں وہی پرانی شان برقرار ہے۔ جھاڑ اور
فانوس لگے ہوئے ہیں۔ خاندان کے تمام راجاؤں کی قد آدم تصویریں، سنہرے فریموں میں جڑی
گول کمرے میں اب بھی لگی ہیں۔ ایک پوری دیوار پر تلواریں، بندوقیں، خنجر اور دوسرے
اسلحے اُسی شان سے موجود ہیں۔ چند مخملی کرسیاں اب بھی باقی ہیں۔ ہاتھی مر تو گیا ہے لیکن اب
بھی سوا لاکھ کا ہے!

راجا رتن سنگھ اِس حویلی کا آخری وارث تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اُس کی سگائی پاس
کے علاقے کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی ۔۔۔ اٹھارہ سال کی عمر تک راجا کی تربیت
ہوتی رہی۔ اُسے شکار کھیلنا سکھایا گیا، گھوڑ سواری کے کرتب سکھائے گئے، راج نیتی کے گُر
سکھائے گئے۔ سرکار کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کے رموز بتائے گئے۔ حویلی اور اس سے متعلق
دوسری چیزوں کی اونچ نیچ بتائی گئی اور اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کی شادی طے کی گئی۔ تاریخ

کوئی منزل نہیں ہے۔ منزل تو پہلے بھی نہ تھی لیکن منزل کا احساس تو تھا اب یہ احساس بھی چھن
گیا ہے کیا یہ سوچ نہ چھن جائے گی؟

ایک ایک لمحے ایک ایک پل کو یہ کرید کرید کر ابھار رہی ہے۔ اب نہ کریدیں، کون سا
آشیانہ بنانا ہے؟ سارے آشیانے تو کبھی کے اجڑ گئے ہیں بس، اسی ایک لمحے میں، ایک
پل میں سب کچھ ہو گیا اُف! یہ ایک لمحے کا حادثہ" میں نے کبھی اس حادثہ کو نہیں جگاتا تھا۔
— ایک سہما سہما سا، تھکا تھکا سا انسان، وقت کی کڑی سے کڑی ملاتا ہوا، زندگی کے
اندھی وادی پہیے کو چلاتا ہوا، بھلا یہ انسان کوئی حادثہ کیسے جگائے گا — ایک چھوٹا سا
محور، چھوٹا سا آنگن، چھوٹا سا آسمان، چھوٹی سی دنیا! کوئی ارمان نہیں، کوئی خواہش نہیں،
کوئی دکھ نہیں، کوئی خوشی نہیں، کوئی حل نہیں، کوئی انا نہیں — اسی بے رنگ دکھ دنیا کا
باسی، بھلا میں وقت کے ساتھ کیا اُلجھتا!

صبح دس بجے کالج جاتا تھا، شام کو چار بجے آخری کلاس لینے کے بعد گھر واپس آتا تھا۔
بہت ہوا تو چھٹی کے دن سینما دیکھنے چلا گیا۔ زکی کے سوا کوئی مونس نہیں غمخوار نہیں۔ کوئی دوست
نہیں زکی جس نے ساری عمر نوکرانی کے بھیس میں بتائی تھی میری نوکرانی نہیں، اُس کی نوکرانی —
وہ مالکن تھی زکی کی بھی اور میرے اِس چھوٹے سے فلیٹ کی بھی۔ کہنے کو تو میں نے فلیٹ کہہ دیا
لیکن اصل میں یہ اس حویلی ہی کا ایک حصّہ ہے۔ تھوڑا سا ادل بدل کر کے اسے فلیٹ کی سی شکل
دے دی گئی ہے کیونکہ حویلیوں کا رواج اب نہیں رہا۔ بیچ میں ایک لمبا چوڑا دالان ہے
اُس سے ذرا ہٹ کر حویلی کا مرکزی حصّہ ہے، جس میں زکی اور اُس کی مالکن کا گھر ہے دائیں
اور بائیں حصّے میں کچھ کمرے کرایہ پر اُٹھائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک اصطبل بھی تھا۔
اب تو اسے تبدیل کر کے گیرج بنا دیا گیا ہے — جس میں وہ ہلکے آسمانی رنگ کی شیورلیٹ
کار رہتی ہے، جو ظاہری خوبصورتی کے باعث نئی معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت پرانا ماڈل
ہے اُس کے ساتھ ہی دو کمرے ہیں جن میں ڈرائیور اور اُس کا کنبہ رہتا ہے ان کمروں سے
ذرا ہٹ کر باورچی کا کمرہ ہے جس میں وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہتا ہے اس کمرے کے بعد

سب کچھ ختم ہو گیا ہے ابھی پلک جھپکتے ہی میں۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ کہاں کا تانا
ٹ گیا اب کوئی کشش محسوس نہ ہوگی، کوئی محور پہلو میں باقی نہ رہے گا، کوئی آگ سینے میں
جلے گی بھیانک اور گہرے اندھیرے کا کوئی احساس دل میں ہراس نہ جگائے گا اب تو
سب سناٹا ہے گہرا سناٹا!

جیسے رات بھر کسی بیمار نے درد میں تڑپ تڑپ کر مچل مچل کر چیخ چیخ کر صبح ہوتے
ہوتے دم توڑ دیا ہو۔

آگے کیا ہوگا — کیا ہوگا؟

دھبے پیلے رنگ کے کاغذ کا پُرزہ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے بہت دُور چلا گیا
ہے اتنا دُور نہیں کہ میں دیکھ ہی نہ سکوں لیکن اتنا دُور ضرور ہو گیا ہے کہ میں اُسے چھو نہ سکوں
رہ جائے یہ کیسا بے حسی کا عالم ہے کہ اُٹھا نہ جا سکے گا کوئی انگ ہلایا نہ جا سکے گا صرف آنکھیں
جو دیکھ رہی ہیں دماغ ہے جو سوچ رہا ہے نہ جانے کیا سوچ رہا ہے اب اس سوچنے کی

O

انسان کی زندگی میں چند سایہ دار شجر ضرور
آتے ہیں۔
یہ انسان کے ساتھ قدرت کا وعدہ ہے۔
میرے ساتھ بھی قدرت نے یہ وعدہ کسی حد تک نبھایا
ہے۔ اور مجھے چند خوبصورت، سر سبز اور ہرے بھرے
درختوں کی چھاؤں عطا کی ہے — ان درختوں کی چھاؤں
میں بیٹھ کر میں نے بھی چند تیز دھوپ کے لمحے روشن کیے ہیں
میں اپنی یہ کتاب انہی سایہ دار درختوں کے
نام معنون کرتا ہوں۔

پہلا شجر: مرشد کامل
(پنڈت جانکی ناتھ ڈاتی بی اے ایل ایل بی)

دوسرا شجر شفیق معالج
(ڈاکٹر ایس کے تکلو ورلش)

تیسرا شجر آخری دوست
(سریندر ناتھ تیور)

———★ پشکر ناتھ

٦

فہرست

कांच की दुनिया

کانچ کی دنیا

پشکر ناتھ

سیمانت پرکاشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کانچ کی دنیا